Title - SAAL NAAMA TALEEM (Part-1).

Creator - Hyderabad Educational conference

Publisher - Azizyia Printing Press (Hyderabad).

Date - 1366.

Pages - 122.

Subjects - Taleem - Hindustani Musalman; Taleemi Idare.

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس
انجمن ترقی تعلیم حیدرآباد دکن

# سالنامہ تعلیم

حصہ اول

سنہ ۱۳۵۶ ف



مطبوعہ
عزیزیہ پرنٹنگ پریس ترپ بازار
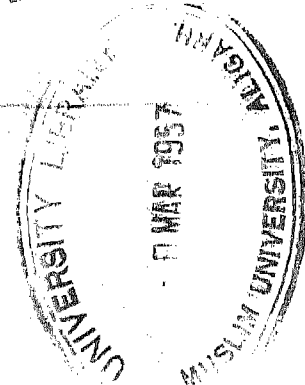
# فہرست مضامین

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس ایک عرصہ سے اس بات کی کوشاں تھی کہ مفید عام اور تعلیمی معلومات وقتاً فوقتاً شائع کئے جائیں۔ الحمدللہ اب اس کا آغاز کیا جاتا ہے۔ حالیہ سالنامہ میں ملک کی ضروریات تعلیم پر چند مقالات قارئین کے مطالعہ کے لئے پیش کئے جا رہے ہیں۔ ان کے پڑھنے کے بعد معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس قدر سود مند ہیں۔

اس سالنامہ کا دوسرا حصہ ممالک محروسہ سرکار عالی کے تعلیمی اور سررشتہ واری امتحانوں اور ٹریننگ کلاسوں وغیرہ کی تفصیلات پر مشتمل ہوگا۔ جو سررشتہ تعلیمات کے سالانہ تعطیلیوں کے بعد قریب میں شائع کیا جائے گا۔

توقع ہے کہ کانفرنس کے وظائف اور سالانہ اجلاسوں کے ساتھ ساتھ کچھ تحقیقاتی کام بھی کیا جائے گا۔ اور فضلِ الٰہی سے معیاری مقالات و کتب کی اشاعت کا سلسلہ بھی جلد شروع ہو جائے گا۔ فقط

۱۱ ربیع المنور سنہ ۱۳۶۶ھ

محمد عبدالرحمٰن خاں
صدر حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس
و حیدرآباد اکیڈمی

# اسلام کی نظر میں تعلیم کا مقصد

از ڈاکٹر میر ولی الدین (جامعہ عثمانیہ)

گر جرعۂ ز جام معرفت نوش شود  
ویں کشمکش ہوا فراموش شود  
قلب عارف زیر فلک کے گنجد  
کے دریا را حباب سرپوش شود

(سحابی استرآبادی)

نزول کے اعتبار سے قرآن مبین کی سب سے پہلی آیت اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ سے یہ بات صاف طور پر سمجھ میں آتی ہے کہ پیدا کرنے والے نے ہمیں پڑھنے اور سیکھنے ہی کے لئے بنایا ہے ہمیں کان، آنکھ، اور دل (یا قرآن کے الفاظ میں سمع، و بصر و فؤاد) مشاہدہ، تجربہ، و استنباط نتائج ہی کے لئے عطا کئے گئے ہیں! عام طور پر ہمارے علم کا معروض ہماری ذات یا انفس ہے پھر آفاق ہے اور پھر انفس و آفاق کا پیدا کرنے والا! انفس و آفاق کی نشانیوں کا جاننا حق تعالیٰ کی معرفت کے لئے ضروری ہے اور قرآن نے علم کی حقیقی غایت حق تعالیٰ ہی کے عرفان و وجدان کو قرار دیا ہے! حق تعالیٰ کے عرفان ان کی یافت و شہود سے بڑھ کر اور کیا شئی ہو سکتی ہے جس سے انسان ایک لحظہ بھی مطمئن و شاد کام ہو سکتا ہو۔

کیست زو بہتر بگو اے ہیچ کس  
تا بداں دل شاد باشی یک نفس  
من ز شادی خواہم و نے خسروی  
انچہ می خواہم من از تو ہم توی

(رومی)

علم کا مقصدِ اولین حق تعالیٰ کا عرفان ہے، یعنی یہ جاننا ہے کہ حق تعالیٰ کن اسمائے
حسنیٰ، صفاتِ علیہ و افعال باہرہ سے موصوف و متصف ہیں، ان کا اظہار کس طرح کائنات
کی لامتناہی اشیاء اور انفس کی لاتعداد احوال و آثار میں ہو رہا ہے۔ قرآن کریم کے ارشادات
کی روشنی میں عقل کو تابع وحی کرکے آفاق پر نظر ڈالی جائے تو ہر ورق معرفتِ کردگار کا
دفتر بن جاتا ہے اور ہر ذرہ اسکی وحدت کا گواہ، اور تمام عالم اسی کے جمال کا آئینہ نظر آنے
لگتا ہے!

ہمہ عالم جمال طلعتِ اوست　　گر کسے را کہ ایں نظر باشد!

(سعدیؒ)

ایمان کی اس نظر میں جب کائنات جلوہ گاہِ حق دکھائی دینے لگتی ہے تو نتیجہ کے طور
پر حق تعالیٰ کی عظمت و جلالت، ان کی خشیت و محبت سے انسان کا قلب معمور ہو جاتا ہے
اور اس حلاوت و لذت سے آشنا ہو جاتا ہے جو ذاتِ حق کا خاصہ ہے!

کائے بلبل جان مست بیاد تو مرا　　وے پایۂ غم پست بیاد تو مرا
لذات جہاں را ہمہ در پا فگند　　ذوقیکہ دہد دست بیاد تو مرا

(جامیؒ)

اسماء و صفات و افعالِ حق کے عرفان کے بعد علم کا مقصد قرآن کی رو سے جاننا ہے کہ
کون سے اعمال، احوال، اقوال یا اعتقادات ہیں جو حق تعالیٰ کو محبوب و پسندیدہ ہیں
اور وہ چیزیں کونسی ہیں جو ان کو پسند نہیں اور جن سے انہوں نے انسان کو روکا ہے!
قرآن مجید نے حق تعالیٰ کی مرضیات کی تفصیل ایمان، توحید، صدق، استقامت، سنت
حسنہ، یاد، محویت فی الحق، یافت و شہودِ حق کے سلسلہ میں شرح و بسط کے ساتھ کی ہے
اور شرک و کفر، نفاق و ارتداد، بدعت و فسق، غفلت و محویت فی المخلوق اور یافت
و شہود و خلق کو کھول کر بیان کر دیا ہے اور "مقربین"، "اصحاب یمین"، اور "اصحاب شمال"
کے مقام و صفات کو واضح طور پر متعین کر دیا ہے۔ خیر و شر، علم ہدایت و علم ضلالت قطعاً

حق تعالیٰ ہی عطا کرتے ہیں! خیر و شر میں امتیاز کرنا وہی سکھلاتے ہیں" وھدینٰہ النجدین سے یہی مراد ہے، بدکرداری اور پرہیزگاری کا القا بھی ان ہی کی جانب سے ہوتا ہے تاکہ کتاب و سنت کی روشنی میں بدکرداری سے گریز اور پرہیزگاری پر عمل کیا جاسکے فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا (۳۰ ع ۱۶) سے یہی مطلب ہے! حق تعالیٰ ہی کو علم کا مبداء قرار دے کر علم ہدایت و علم اضلال کی تشریح ایک نقشہ سے کی جاسکتی ہے جو قرآنی تفصیلات کے اظہار میں "الیم فی اسم" یا "دریا بکوزہ" کا مصداق ہے۔

اللہ[1]

| مضل | | ہادی |
|---|---|---|
| نامرضیات | علم حق | مرضیات |
| مظہر نفس و شیطان | انسان | مظہر قلب و روح |

علم

| شر | خیر |
|---|---|
| شرک | توحید |
| کفر | ایمان |
| نفاق | صدق |
| ارتداد | استقامت |
| بدعت | سنت |
| فسق | حسنہ |
| غفلت | یاد |
| محویت فی الخلق | محویت فی الحق |
| یافت و شہود خلق | یافت و شہود حق |
| اصحاب شمال | مقربین / اصحاب یمین |
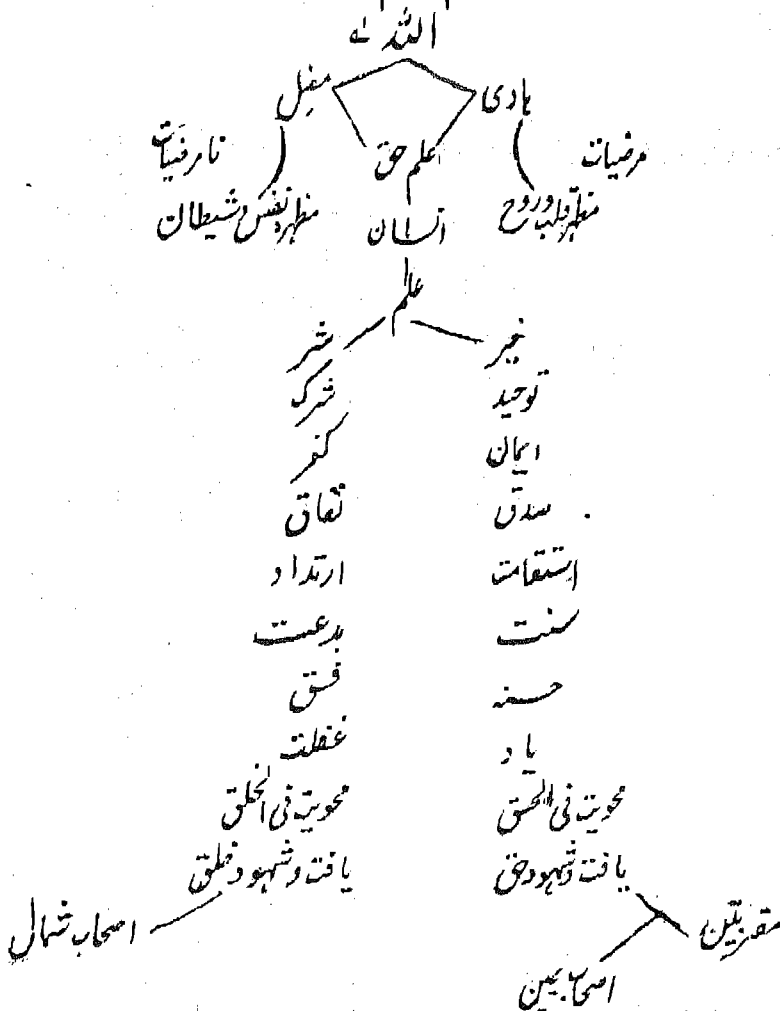
[1] اسکی وضاحت کیلئے دیکھو مولف کی کتاب قرآن اور تصوف۔ باب عبادت و استعانت وغیرہ یا قرآن و تعمیر سازی باب اول۔

جو شخص علم کی ان تفصیلات سے واقف ہو جاتا ہے وہ علم ہدایت پر عمل پیرا ہونے لگتا
وہی کرتا ہے جن میں حق تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی ہوتی ہے اور ان چیزوں سے گر
کرتا ہے جن کو وہ مکروہ و ناخوش رکھتے ہیں! اپنے اس مجاہدہ و ریاضت کی وجہ
اصحاب یمین کے درجہ سے بلند ہو کر مقربین میں شامل ہو جاتا ہے اور جنت ذات پر
قیام پیدا کر لیتا ہے فروحٌ و ریحانٌ و جنت نعیم !

خواہم کہ ہمیشہ در ہوائے تو زیم — خاکے شوم و بزیر پائے تو زیم
مقصود من خستہ ز کونین توئی — از بہر تو میرم و برائے تو زیم

(قاسم)
قرآن کریم نے علم کے یہی دو مقصود قرار دیئے ہیں! چنانچہ امام احمد رضؒ نے
معروف سے نقل کیا ہے کہ اصل علم حق تعالیٰ کا ڈر ہے، یعنی سارے علم کی جڑ وہ علم ہے
جو موجب خشیت و محبت و قرب حق ہو اور بندہ کو حق تعالیٰ سے مانوس کرے اور ان کے
شوق کا شعلہ اسکے قلب میں پیدا کرے اور یہ جیسا کہ اوپر کہا گیا، حق تعالیٰ کے اسماء
وصفات و افعال کو جاننے سے پیدا ہوتا ہے۔ اسکے بعد وہ علم ہے جو حق تعالیٰ کے احکام
اور اس قول یا عمل یا حال یا اعتقاد سے انسان کو واقف کرائے جو ان کو محبوب ہیں اور
پسندیدہ! اس علم کو زبان سنت میں "علم نافع" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اس کے ازدیاد
کی دعا کی گئی ہے۔ اَللّٰھُمَّ انْفَعْنِی بِمَا عَلَّمْتَنِی وَعَلِّمْنِی وَزِدْنِی عِلْمًا وَارْزُقْنِی
عِلْمًا تَنْفَعُنِی بِہٖ (رواہ الترمذی) "حق تعالیٰ جو علم آپ نے مجھے سکھلایا ہے
اس سے نفع اندوز کیجئے، اور جو علم نافع ہے وہ مجھے سکھلائیے اور میرے
علم میں زیادتی کیجئے، اور وہ علم مجھے عطا کیجئے جس سے میں نفع اندوز ہوں"
دوسری حدیث میں علم نافع کا سوال کیا گیا ہے اور غیر نافع سے استعاذہ:۔
اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُکَ عِلْمًا نَافِعًا وَاَعُوْذُ بِکَ مِنْ عِلْمٍ لَا یَنْفَعُ
(اخرجہ النسائی وابن ماجہ ولفظہ ان النبی صلعم قال سلوا اللہ علماً نافعاً وتعوذوا باللہ
من علم لا ینفع)

جس شخص کو "علم نافع" حاصل ہوگیا اس نے اس کے ثمرات کے طور پر "قلب خاشع" بھی پایا "نفس قانع" بھی اور "دعائے مسموع" بھی! اسکا قلب اپنی وسعت کے لحاظ ساری کائنات میں نہیں سما سکتا کیا حباب دریا کا سرپوش ہوسکتا ہے؟

مَنْ وَسِعَ الْحَقَّ فَمَا ضَاقَ عَنْ خَلْقٍ فَكَيْفَ الْأَمْرُ يَا سَامِعْ! [۱]

(شیخ اکبرؒ)

علم کے ان ثمرات پر ایک نظر ڈالو :-

(۱) قلب خاشع: علم نافع جب قلب میں اتر جاتا ہے تو اب وہ قلب حق تعالیٰ کے لیے خاشع اور شکستہ ہوجاتا ہے اور اسکی ہیبت و جلال کے سامنے اسکی خشیت و محبت و تعظیم کے لیے سرافگندہ اور ذلیل ہوجاتا ہے! اور جوں جوں اسکا علم بڑھتا جاتا ہے، حق تعالیٰ کی معرفت بھی زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ ان کی خشیت و محبت میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے اور اسکا ذل و انکسار بھی روز افزوں! اسی کیفیت قلبی کو سعدیؒ نے ان مشہور اشعار میں ادا کیا ہے :-

در خاک بیلقان برسیدم بعابدے — گفتم مرا بہ تربیت از جہل پاک کن!
گفتا برو چو خاک تحمل کن اے فقیہ — یا ہرچہ خواندۂ ہمہ در زیر خاک کن!

(سعدیؒ)

علم کا ثمرہ ہی خشیۃ اللہ ہے إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (۲۲ع۱۶) حق تعالیٰ سے ان کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں! اسی لیے ابن مسعودؓ وغیرہ نے کہا ہے کفی بخشیۃ اللہ علماً وکفی بالاغترار باللہ جہلاً، "علم کا نتیجہ خوف خدا" اور جہل کا نتیجہ بے خوفی اور دھوکا! علم خوف خدا کا نام ہے، کثرت روایات کا نہیں۔ معلومات کا ذخیرہ جمع کرنے کا نہیں، دماغ کو علوم رسمی سے پُر کرنے کا نہیں لیس العلم بکثرۃ الروایۃ ولکن العلم خشیۃ! عالم وہی ہے جو خدا سے ڈرتا ہے اور جاہل وہی ہے جو اسکی نافرمانی کرتا ہے "من خشی اللہ فھو عالم ومن عصاہ فھو جاھل"

---

[۱] جس میں حق سما گیا وہ خلق سے کیوں کر تنگ ہوسکتا ہے اور اس کا کیا حال ہوگا اے سننے والے

عالم کی اس تعریف کو پیش نظر رکھ کر ہم ہر کتاب خواں اور کتاب داں کو عالم نہیں کہہ سکتے
چنانچہ اسی معیار سے جانچ کر امام شعبیؒ اپنے زمانے کے علماء سے کہا کرتے تھے کہ
تم عالم نہیں "متلذذ بالمسائل" ہو ( INTELLECTUAL EPICURE ) ہو
تمہیں علمی مسائل سے بحث کرنے میں لذت ملتی ہے اور یہی لذت تمہارا مقصود و غایت ہے
اسی پر تم فدا ہو عالم دراصل "عامل للہ فی اللہ عارف باللہ" ہے یعنی عالم وہ
ہے جو عرفان حق اور خوف خدا رکھنے کی وجہ سے اللہ ہی کے لئے عمل کرتا ہے۔
اس کے عمل و مجاہدہ کا مقصود اللہ ہی کی رضا و محبت ہوتی ہے! اسکا مطلوب و محبوب
صرف حق تعالیٰ ہی ہوتے ہیں!

دل از غم کائنات برداشتہ بہ!   جز یاد تو ہر چہ ہست بگذاشتہ بہ!
چشمی کہ نہ از نور تو روشن باشد   بشگافتہ و بخاک انباشتہ بہ!

(۲) نفس قانع: قلب خاشع کا لازمی نتیجہ نفس قانع ہے۔ جب دل میں خشوع
پیدا ہو گیا، حق تعالیٰ سے ذل و افتقار کی نسبت قائم ہو گئی تو اب نفس اللہ سے راضی
اور غیر اللہ سے مستغنی ہو جاتا ہے۔ "اب غنی عن الاشیاء" ہو جاتا ہے! وہ جانتا ہے کہ
کوئی شئے حق تعالیٰ سے برتر نہیں جس کے حصول کی وہ خواہش کر سکے اب سب کچھ اسے
حاصل ہو جاتا ہے! اسی لئے فرمایا گیا ہے لکیلا تاسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا
بما اتاکم! اسکو علو کے تمکین حاصل ہو جاتی ہے، وہی مخاطب ہوتا ہے اس
قول کا: انتم الاعلون واللہ معکم!

نفس ساری کائنات کو پا کر بھی حریص رہ سکتا ہے، ھل من مزید کا نعرہ
لگا سکتا ہے! لیکن جب وہ حق تعالیٰ کو پا لیتا ہے، ان سے مانوس ہو جاتا ہے تو
پھر دنیا اس کی نظر میں حقیر و ذلیل ہو جاتی ہے اور حق تعالیٰ کی عظمت و جلال سے اسکا
پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے! اثر اسرائیلی میں اسکا ذکر بڑی خوبی سے آیا ہے:-
ابن آدم اطلبنی تجدنی، فان وجدتنی وجدت کل شیء وان فتک فاتک کل شیء وانا احب الیک من کل شیء

ابن آدم تو مجھے طلب کر تو مجھے پائے گا۔ جب تو نے مجھے پا لیا تو گویا تمام چیزیں تجھ کو مل گئیں۔ اگر تو نے مجھے کھو دیا تو گویا تو نے تمام چیزوں کو گم کر دیا۔ میں تیرے نزدیک ہر شئے سے زیادہ محبوب و پسندیدہ ہوں! اسی مفہوم کو کسی عاشق نے یوں ادا کیا ہے :۔

لِكُلِّ شَيْءٍ إِذَا فَارَقْتَهُ عِوَضٌ ۔۔۔ وَلَيْسَ لِلّٰهِ إِنْ فَارَقْتَ مِنْ عِوَضِ[۱]

عارف رومیؒ نے اسی چیز کو اپنے سریلے نغموں میں یوں ادا کیا ہے کہ جب بندہ کو اپنے شاہ ذیجاہ سے انس و پیار پیدا ہو جاتا ہے تو پھر اسکو سارے دروازوں کی دوا مل جاتی ہے اور وہ اسکی طرف اپنا رخ پھیر کر سارے جہاں سے فارغ و بے فکر ہو جاتا ہے:۔

ہر کہ شد مستش شاہ فرد خویش ۔۔۔ یافت در ماتہا ئے جملہ درد خویش

چوں ازاں اقبال شیریں شد دہاں ۔۔۔ سرد شد بر آدمی ملک جہاں!

(رومی)

حق تعالیٰ سے مانوس ہو کر اس کا نفس دنیا سے سیر ہو جاتا ہے۔ زال دنیا کے اطوار سے بیزار ہو جاتا ہے، وہ طالب علو و رفعت نہیں ہوتا۔ وہ اپنی شہرت کا خواہاں نہیں رہتا، اس کو دولت و ثروت کی ہوس نہیں رہتی، وہ ہمعصروں اور دوستوں میں بلندی کی تمنا نہیں کرتا، اسکو لوگوں کی نگاہوں میں عظمت حاصل کرنے کی آرزو نہیں رہتی، اور مجلسوں میں ہاتھوں ہاتھ لئے جانے کی خواہش نہیں رہتی (امام سفیان ثوری)۔ امام حسنؓ کے الفاظ میں وہ "الزاهد في الدنيا، الراغب في الاخرة، البصير بدينه المواظب على عبادة ربه ہو جاتا ہے! یعنی دنیا میں زہد اختیار کرتا ہے، آخرت کی طرف مائل ہوتا ہے، اپنے دین میں بصیرت رکھتا ہے، اور اپنے رب کا عبادت گزار بندہ بن جاتا ہے"۔ "وہ اپنے بڑے پر حسد نہیں کرتا اور اپنے سے چھوٹے کا مذاق نہیں اڑاتا۔" جوں جوں اسکا علم بڑھتا جاتا ہے حق تعالیٰ کا خوف بڑھتا جاتا ہے، تواضع و انکساری میں زیادتی ہوتی جاتی ہے"۔ اهل العلم اليا ثم كلما ازداد و من هذا ازدادوا لله تواضعا وخشية وانكسارا وذلا" (ابن عمر)

---

[۱] ۔ ہر چیز کا جو کچھ سے جاتی رہے بدلہ ہے لیکن اللہ اگر تجھ سے جاتا رہے تو اسکا کوئی بدل نہیں۔

وہ حق تعالیٰ ہی کے لیئے زندہ رہتا ہے، مال و گنج کے لیئے نہیں، وہ حق تعالیٰ ہی کے لیئے جان دیتا ہے خوف و رنج سے نہیں مرتا۔

| | |
|---|---|
| ہر کجا امر قدم را مسلکیست | زندگی و مردگی پیشش یکیست |
| بہر یزداں می زید نے بہر گنج | بہر یزداں می مرد نز خوف و رنج |
| ہست ایمانش برائے خواہ او | نے برائے جنت و اشجار و جو! |
| ترک کفرش ہم برائے حق بود | نے ز بیم آنکہ در آتش رود |
| ایں چنیں آمد ز اصل آں خوی او | نے ریاضت نے بجستجوئے او |
| آنگہاں خندد کہ او بیند رضا | ہمچو حلوائے شکر او را قضا |

(رومی)

(۳) دعائے مسموع:- جب قلب میں خشیت پیدا ہوگئی اور وہ حق تعالیٰ کی محبت سے منور ہوگیا اور دنیا سے شکم سیر ہوگیا تو اب وہ حق تعالیٰ کی نظر میں محبوب ہو جاتا ہے، اب اس کو ذکر و دعا میں حلاوت، مناجات میں لذت، ادائے فرض عبودیت میں سرور و مسرت حاصل ہونے لگتی ہے اب وہ اپنے رب سے جو کچھ مانگتا، اسکو دیا جاتا ہے، جو دعا کرتا ہے قبول کی جاتا ہے، چنانچہ حدیث قدسی میں صاف وعدہ کیا گیا ہے:-

لَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى أُحِبَّهُ اِلٰى قوله فَلَئِنْ سَأَلَنِي لَأُعْطِيَنَّهُ وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِي لَأُعِيذَنَّهُ (وفي رواية) وَلَئِنْ دَعَانِي لَأُجِيبَنَّهُ[1] (رواه البخاري)

جب بندہ کو حق تعالیٰ سے انس و تقرب حاصل ہو جاتا ہے تو اب اس کی دعا مسموع

---

[1] پوری حدیث کا ترجمہ یہ ہے: ہمیشہ میرا بندہ نزدیک ہوتا ہے مجھ سے بذریعہ نوافل کے تا آنکہ دوست رکھتا ہوں میں اسکو تو ہوتا ہوں میں شنوائی اسکی جو سنتا ہے وہ اس سے، اور بینائی اسکی جو دیکھتا ہے اس سے، اور ہاتھ اسکا جو پکڑتا ہے اس سے، اور پیر اسکا جو چلتا ہے اس سے، اور اگر سوال کرے مجھ سے تو دیتا ہوں میں اسکو، اور اگر پناہ مانگے مجھ سے تو البتہ پناہ دیتا ہوں میں اسکو (اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ) اگر وہ دعا کرے مجھ سے تو البتہ میں اسکی دعا قبول کرتا ہوں۔ (بخاری)

ہوتی ہے، اس کا سوال پورا کیا جاتا ہے اور وہ حق تعالیٰ کی پرورش میں آجاتا ہے وہ اس کے ولی ہوجاتے ہیں اس لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو وصیت فرمائی تھی کہ :۔

"یا غلام ! احفظ اللہ یحفظک، احفظ اللہ تجدہٗ امامک، تعرف الی اللہ فی الرخاء یعرفک (اللہ) فی الشدۃ " یعنی اے لڑکے تو حق کو نگاہ رکھ (اس طرح کہ اوامر و نواہی کو بجالا اور قضاء و قدر کو مان) تو اللہ تجھ کو تجھ کو اپنی حفاظت میں رکھیگا، تو اللہ کو نگاہ رکھ (مراقبہ علم و حضور و معیت کے ساتھ) تو اسکو اپنے سامنے پائیگا (وہ تجھ کو دنیا و آخرت دونوں کی آفتوں سے محفوظ رکھیگا)، تو اللہ کی یاد آرام و چین کی حالت میں کر وہ تجھ کو سختی کی حالت میں یاد کرے گا، (تیری دعا کو قبول کرے گا اور تیری مصیبت کو دور کرے گا!) اسی لیے تو عارف رومیؒ نے کہا تھا :۔

زندگی بے دوست جاں فرسودن است! مرگ حاضر غائب از حق بودن است!

عمر و مرگ ایں ہر دو با حق خوش بود! بے خدا آب حیات آتش بود!

(رومیؒ)

جب علم نافع نے ہمیں قلب خاشع، نفس قانع، دعائے مسموع کی نعمتوں سے بہرہ یاب کر دیا تو اب ہمیں حق تعالیٰ ہی میں مشغولیت حاصل ہوجاتی ہے، تمام عالم سے محو و فانی ہو کر باقی بحق ہوجاتے ہیں، ماسوی اللہ سے قلب کا تخلیہ ہوجاتا ہے اور یافت و شہود حق ہی ہمارا عمل ہوجاتا ہے، یعنی ہم مخلوقات کو چھوڑ کر 'خالق میں' 'معلومات' کو ترک کر کے 'عالم میں' مصروف ہوجاتے ہیں۔ یہ ہے علم نافع کا ثمرہ اور اسکا انجام!

چوں بہ مطلوبت رسیدی اے ملیح شد طلب کاری علم اکنوں قبیح

چوں شدی بر بامہائے آسماں سرد باشد جستجوئے نردباں (رومیؒ)

نسأل اللہ علماً نافعاً و نعوذ بہ من علم لا ینفع و من قلب لا یخشع و من نفس لا تشبع و من دعاء لا یسمع، اللھم انا نعوذ بک من ھؤلاء الاربع ۔

# مسئلہ تعلیم

از جناب مولوی محمد عبدالرحمن خان صاحب (صدر حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس و حیدرآباد اکیڈیمی)

## تاریخی واقعات نسبت تعلیم انگلستان

تعلیم کا مسئلہ ہر ملک اور ہر زمانہ میں اعلیٰ مفکرین اور مستند علماء کا طالب غور و دائمی عمل رہا ہے اسوقت دو عالمگیر خونخوار جنگوں کے بعد اسکی اہمیت اور پیچیدگی اور بھی بڑھ گئی ہے۔ اس لئے راقم الحروف نے حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی دعوت پر اس امر کی کوشش کی ہے کہ مختلف ممالک مشرق و مغرب میں تعلیم کے جدید رجحانات کا مختصر حال لکھے اور بتائے کہ ہندوستان اپنے تمدنی معاشی معاشرتی و مذہبی خصوصیات کے زیر اثر ان سے کیا سبق سیکھ سکتا اور اپنے لئے کیا لائحہ عمل اختیار کر سکتا ہے۔

مضمون بہت وسیع اور پریشان کن ہے۔ اگرچہ میری عمر مختلف طریقوں سے تعلیم ہی کی خدمت میں صرف ہوئی۔ اور مجھ کو مدارس، کلیات، جامعات کی تقریباً تمام جماعتوں کی تدریس اور انتظام تدریس و نگرانی کا کافی تجربہ حاصل ہے تاہم میں نہایت افسوس کے ساتھ معترف ہوں کہ اس مختصر مقالہ میں صرف چند سربرآوردہ ممالک کے بعض اہم تعلیمی اداروں کے اجمالی حالات و مقاصد اور ان کے حالیہ رجحانات کا خاکہ ہی پیش کیا جا سکا۔ یوں تو اس وقت سینکڑوں کتابیں اور مقالے صرف انگلستان کی بدلتی ہوئی حالت سے متعلق اصلاح طریقہ تعلیم پر طبع ہو چکے ہیں۔ میری دانست میں مندرجۂ ذیل کتب کا تفصیلی مطالعہ ہمارے ملک کے تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے مفید ثابت ہوگا۔

1. Education for the people by Dr. F. H. Spencer
2. Education for a New Society by Ernest Green.
3. The future in Education by Sir Richard Livingstone
4. Looking Ahead: A plan for Youth by The Educational Sub Committee of the Central Committee on post-War Re-construction.
5. A Democratic Reconstruction of Education by 4 Secondary School Head-masters' and discussed at a large Conference of teachers etc at County Hall in London.
6. About Education by C. E. M. Joad.
7. Some Comparisons between Universities: Second Educational Conference April 15, 1944.

ممالک متحدہ امریکہ کی کتابوں میں سے صرف دو کا تعارف کیا جاتا ہے۔ ان کی فہرست بھی بہت بڑی ہے:

1. War and Education by Porter Sargent (Boston Mass
2. The future of Education by Sargent ( Do. )

مسٹر آر۔ اے۔ بٹلر ( R.A. Butler ) کے ایجوکیشن ایکٹ کا مطالعہ ہر انگریزی داں کے لئے ضروری ہے۔ راقم نے جوڈ ( Joad ) کی کتاب سے انگلستان وغیرہ کے سررشتہ جات تعلیم سے متعلق اعداد و شمار فراہم کئے ہیں۔ ڈاکٹر سر محمد ضیاء الدین کی کتاب موسوم بہ نظام تعلیمات میں دوسری عالمگیر جنگ سے پہلے کے تفصیلی حالات انگلستان، جرمنی،

فرانس وغیرہ سے متعلق درج ہیں۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ انسان جس وقت سے متمدن زندگی بسر کرنے لگا اس کو اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کا خیال ہوا۔ لکھنا ایجاد ہوا تو لکھنا پڑھنا سیکھنا سکھانا لازم اور ملزوم ٹھیرے اینٹ پتھر ہڈی چمڑے پتے اور بالآخر کاغذ پر تحریر منتقل ہوئی تو کتابیں اور کتب خانے رائج ہوئے۔ عالم اور معلم کی ضرورت و اہمیت محسوس ہوئی۔ زمانہ قدیم کے ہر متمدن ملک میں معلم کا درجہ اسکے علم کی وجہ سے بلند تھا۔ قرون وسطیٰ میں جب کہ مسلمان تقریباً ساری وسطی و مغربی دنیا پر مسلط ہو چکے تھے ارشاد نبویؐ کے بموجب انھوں نے علم کی بڑی قدر کی۔ اسی لیئے عرب تہذیب کے اسلامی ممالک میں خواندگی بلکہ شعر گوئی آبادی کے ہر طبقہ میں سرایت کر گئی۔ علماء کی کثرت تھی اکثر عالم متعدد علوم و فنون کے ماہر ہوتے تھے۔ قضاۃ وزارت اور حکومت کی چھوٹی کی دیگر خدمات پر بلا لحاظ قوم و ملت علماء ہی مامور کئے جاتے تھے۔ دولتمند اور مفلس سبھوں کے لیئے خواہ بڑا ہو یا بچہ مسجد کی طرح مسجد کے مدارس کھلے ہوتے تھے۔ مرد کی طرح عورت بھی تحصیل علم میں کوشاں تھی۔

دوسرے اقوام میں تعلیم کے طریقے مذہبی، فرقہ واری اور معاشری امتیازات سے خالی نہ تھے، جیسا کہ قدیم ہندوستان اور چین کی تاریخوں سے پتہ چلتا ہے اور انگلستان جیسے آزاد اور روشن خیال ملک میں اب بھی دولتمند اور مفلس کی تعلیم میں یہ امتیاز موجود ہے، نہ از روئے قانون و روایات بلکہ از روئے قیود اقتصادی و معاشی حالت۔ انھیں مشکلات و امتیازات کو رفع کرنے کے لیئے اس ملک میں ان دنوں تنظیم مابعد جنگ کے سلسلہ میں اصلاح طریقہ تعلیم کی چیخ پکار شدت کے ساتھ سنائی دے رہی ہے۔

برِ اعظم یورپ اور ممالک متحدہ امریکہ میں تقریباً ہر جگہ تعلیم حکومت کا فرض منصبی سمجھی گئی ہے۔ تعجب کا مقام ہے کہ دو صدی پہلے تک انگلستان میں ایسا نہیں تھا۔ وہاں عوام کی تعلیم کے محرک اٹھارویں صدی کا میکانی انقلاب اور مذہبی عقاید کا تحفظ ہیں ۱۸۰۲ء میں فیکٹری ایکٹ نافذ ہوا جس کی رو سے چھ اور بارہ برس کے مابین عمر کے کارخانوں میں

کام سیکھنے والوں کی تعلیم کے لیئے اوقات کار میں مالکان کارخانہ جات کو کچھ انتظام کرنا پڑا۔ اسکے اخراجات بھی انھیں کو اٹھانا پڑتا تھا۔ جب ۱۸۳۳ء کا فیکٹری بل پاس ہوا تو کارخانوں کے مالکوں کو اپنی طرف سے ملازمین کی تعلیم کے لیئے مدرسے قائم کرنے کی ترغیب دلائی گئی۔ ان کے اخراجات کی پابجائی میں حکومت کی بھی امداد تھی۔ سر رابرٹ پیل (۱۷۸۸ء - ۱۸۵۰ء) سے دیکھا نہ گیا کہ اس کے پارچہ بافی کے کارخانوں کے بچے تعلیم سے قطعاً بے بہرہ رہیں۔ از راہ ترحم اس نے اس بل کے ذریعہ ملک کی عام ناخواندگی کا ایک حد تک انسداد کیا۔ جب ریل گاڑیاں چلنے لگیں تو فیکٹریوں کی طرح ریلوں کے ملازموں کو تعلیم کی ضرورت ہوئی اور ان کے لیئے بھی مماثل طریقہ ہائے تعلیم نافذ ہوے۔ ملازم بچوں کا نصف یوم مدرسہ میں تعلیم پانا اور خاص صورتوں میں جز معاشں والدین کے ذریعۂ آمدنی کے نقصان کی تلافی کی غرض سے بچوں کا مدرسہ کی پابندی سے استثنا حاصل کرنا اسی زمانہ سے شروع ہوا۔ [جس معیار کی ان کو تعلیم دیجاتی تھی اور خود مدرسین کی کیا قابلیت تھی ان امور کا چارلس ڈکنز نے اپنے چند ناولوں میں خوب مضحکہ اُڑایا ہے]۔

انگلستان میں تعلیم ۱۸۷۰ء میں جبری قرار دی گئی۔ یہہ تعلیم بچے ۲ ½ گھنٹے نوکری کرنے سے پہلے یا بعد نصف یوم تک حاصل کرتے تھے۔ یہیں ہم ثانوی تعلیم کے مدارس تک اکثر و بیشتر اشخاص کی رسائی ناممکن تھی۔ اس لیئے گیارہ برس کے بعد شاذ و نادر ہی کوئی شخص تعلیم سے مستفیض ہوسکتا تھا۔ فیکٹری اسکول کے مدرس کی تنخواہ چالیس پونڈ سالانہ تھی اور مددگار کی بیس پونڈ۔ ہر مدرس بارہ سر برآوردہ بچوں (یا بچیوں) کو جو تیرہ سال کی عمر کے ہوتے اور مونیٹور ( Monitor ) کہلاتے تھے تعلیم دیا کرتا تھا۔ اس طرح تعلیم پانے اور تعلیم دینے والوں کی تعداد دستے داموں جلد جلد بڑھتی گئی۔

مذہبی اداروں کی طرف سے بھی بچوں کی تعلیم کے لیئے مدرسے قائم کئے گئے۔ سب سے پہلے چرچ آف انگلینڈ نے آرگنائزیشن یعنے عضویہ ( Organization ) موسوم نیشنل سوسائٹی قائم کی۔ برٹش اینڈ فارین اسکول سوسائٹی اور بعد کو انگلیکن، کیتھولک، ویسلیئن وغیرہ اداروں نے بھی

ڈنامنشیل (یعنے مذہبی اصولوں کے) مدارس کھولے گئے۔ ادارہ مجلس انتظامی مقرر کرتا تھا اور مجلس کی طرف سے اساتذہ مامور کیے جاتے تھے۔ جس طرز کے عیسائی عقائد کا ادارہ تھا اسی طرز کی خالص مذہبی تعلیم دی جاتی تھی بلکہ تاریخ و سائنس کی تعلیم پر بھی ان ہی عقائد کا اثر حاوی تھا۔ مارچ ۱۹۳۸ء میں ملک کے جملہ بیس ہزار نوسو دس (۲۰۹۱۰) مدارس میں طلباء کی تعداد (۴۵۲۵۰۰۰) پینتالیس لاکھ پچیس ہزار تھی۔ ان میں سے دس ہزار پانچ سو پچاس مذہبی اداروں کے مدارس تھے جن کے طلباء کی تعداد تیرہ لاکھ چوریہتر ہزار تھی۔ ملک کو عوام الناس کی تعلیم سے کس قدر دلچسپی ہے اسکا اندازہ مندرجۂ ذیل اعداد و شمار سے ہوسکتا ہے:۔ ۱۹۳۷ء میں برطانوی جامعات کو جملہ ذرائع سے امداد دو ملین پونڈ ملی اور امریکی جامعات کو ۴۳ ملین پونڈ امریکہ کی آبادی برطانیہ کی آبادی کے سہ چند ہے۔ لیکن امریکہ کی جامعات میں ہمہ وقتی پروفیسروں اور لکچراروں کی تعداد ایک لاکھ اور طلباء کی تعداد زائد از دس لاکھ تھی۔ برطانیہ کی جامعات میں متناظرا عداد علی الترتیب صرف چار ہزار اور پچاس ہزار تھے۔ امریکی جامعات میں مدت تعلیم چار سال ہے اور برطانوی جامعات میں تین سال۔ جنگ سے پہلے برطانیہ میں بحیثیت مجموعی تعلیم پر پبلک کی جانب سے سالانہ ۱۰۰ ملین پونڈ صرف ہوتے تھے۔ اس کے برعکس ڈور ٹرمنٹ یعنے اشتہاروں پر (عوام کو غیر ضروری اشیاء کی خریداری پر آمادہ کرانے کی غرض سے) ۱۵۰ ملین پونڈ خرچ کیے جاتے تھے۔ مقامی تعلیم کے نگران کار متمول قصاب، نان بائی اور موم بتی بنانے والے ہوا کرتے تھے۔ استادوں کی تنخواہیں بمقابل اور پیشوں کے بہت ہی کم تھیں۔ گزشتہ تیس سال میں بورڈ آف ایجوکیشن کے سولہ پریزیڈنٹ مامور ہوئے جن میں سے صرف تین کو اس خدمت پر مامور کرنے سے پہلے تعلیم کا براہ راست تجربہ حاصل تھا۔

لیکن تمام دنیا جانتی ہے کہ جس طبقہ کو تعلیم سے وابستگی ہے اس سے بہترین قابلیت کے لوگ ہر وقت پیدا ہوئے اور ملک کا نام روشن رکھے اس سے ظاہر ہے کہ برطانیہ میں اہل علم اور متمول ذی اثر طبقہ کی تعلیم ایک طرح کی ہوتی ہے اور جز معاش عوام الناس کی تعلیم اس سے بالکل مختلف ہے اس دورنگی کے مدنظر فرزیلی [illegible]

نے کہا کہ انگلستان میں دو قومیں آباد ہیں۔ ان نقائص کو دور کرنے کے لئے ان دنوں وہاں
بڑی ہلچل مچ رہی ہے۔

برطانوی حکومت سے پہلے ہندوستان میں مسلمان قدیم اسلامی طریقہ پر تعلیم پاتے تھے
اور ہندو قدیم ہندو طریقہ پر۔ اسلامی اور خصوصاً مغلیہ دوروں میں چونکہ فارسی دفتری زبان
تھی اس لئے دفتری ملازمت کے خواہاں فارسی زبان اور ادب کی تحصیل کو اپنا نصب العین
بنا رکھے تھے۔ علم و حکمت کی کتابیں زیادہ تر عربی اور کچھ فارسی میں تھیں۔ تفسیر، حدیث، فقہ
تاریخ و طب کی باقاعدہ تعلیم کا اکثر مدارس میں انتظام تھا۔ ریاضی میں صرف حساب پر توجہ کی
جاتی تھی۔ اس کے دوسرے شعبے اور ہئیت و فلسفہ عامۂ طلباء و اساتذہ کے چنداں مانوس
نہ تھے۔ سائنس کی تعلیم سے اس زمانہ کی دنیا بالکل ناواقف تھی۔ ہندو مسلم اشتراک عمل
سے اردو زبان نے جنم لیا۔ اور سرعت کے ساتھ ترقی کرنے لگی نہ صرف عام بول چال، معاملے
اور روزمرہ زندگی کے جملہ کاروبار کی زبان بن گئی۔ بلکہ شعر و سخن کی خازن بن کر شاہی درباروں
اور امراء کی محفلوں میں مقام عزت پر فائز ہو گئی۔

برطانوی حکومت نے جب زور پکڑا تو آفسوں کا سستے داموں کام چلانے کے لئے انگریزی
پڑھنے لکھنے والوں کی مانگ پیدا ہوئی۔ اور اس کی خاطر حکومت نے انگریزی سکھانے کے
مدارس قائم کئے جو بعد کو یونیورسٹیوں کی شکل میں بی۔ اے۔ ایم۔ اے کی ڈگریوں
کے صنعت گھر ہو گئے۔

جس طرح انگلستان میں عوام کی ناقص یا عارضی تعلیم کا انتظام صنعت و حرفت کی ضروریات
کے مدنظر کیا گیا اسی طرح ہندوستان میں دفتری کاروبار کی اجرائی کی غرض سے سرکاری
و امدادی مدارس اور کالج کھولے گئے۔ مذہبی (عیسائی) جماعتوں نے بھی یہاں انگلستان
کی طرح حکومت کا ہاتھ بٹایا۔ ہندوستانی جامعات (کلکتہ، مدراس، بمبئی) ۱۸۵۷ء میں قائم
ہو کر لندن کی جامعہ کے نقش قدم پر چلائے جانے لگیں جنکو قائم ہو کر صرف انتیس (۲۹)
برس ہی ہوئے تھے۔ بعد کو فنی کالج بھی برطانیہ کی "لال اینٹھ والی" یونیورسٹی

کے اصولوں پر قائم ہوئے ۔ (مسٹر بروس ٹرسکاٹ (Bruce Truscot) نے آکسفرڈ اور کیمبرج کو چھوڑ کر برطانیہ کی جدید اضلاع والی نسبتہً سستی اور فنی جامعات پر ریڈ برک یونیورسٹی (Red brick University) کے نام سے تنقید و نکتہ چینی کی ہے ۵ اپریل ۱۹۴۴ء کی سکنڈ ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ رائل انسٹیٹیوٹ لندن میں مسٹر ٹرسکاٹ نے جامعات کے اساتذہ و طلباء کے باہمی تعلقات پر بھی ایک مقالہ پڑھا ہے)

چونکہ انسان عموماً مقلّد واقع ہوا ہے اور ہندوستان کا طریقۂ تعلیم زیادہ تر برطانیہ کے بہترین نہیں بلکہ عام مروّجہ طریقہ کی نقل ہے ۔ اس لیئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس طریقۂ تعلیم پر دَور حاضر کے خود برطانوی مبصّرین کی تنقید سے قارئین کو روشناس کرایا جائے ۔ برطانیہ میں اس وقت مختلف انواع و اقسام کے کثیر التعداد مدارس ہیں ۔ جوڈ (Joad) نے ان کی ۳۵ قسمیں لکھ ڈالی ہیں ۔ ان کی آمدنی کے ذرائع اور نگرانی کے طریقے بھی بہت مختلف ہیں ۔ وسکی شراب والی رقمی امداد لوکل ٹکسیشن وغیرہ کے مطالب سمجھنے کے لیئے کافی وقت درکار ہے ۔

ان مدارس کا مقصد زیادہ تر ذرائع معاش کی تعلیم ہے ۔ چند ایک میں صحیح ذہنیت کی تربیت بھی مقصود ہے ۔ جب ڈیموکریسی (عمومیہ) کی طرف باشندگان ملک کو مائل کرانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو سیٹزن شپ (شہریت) کے لیئے بھی تعلیم دلانے کا خیال پیدا ہوا ۔ لیکن عوام الناس کے بچوں کو ۱۴ برس کی عمر کے بعد تعلیم سے محروم رکھنے سے آخر الذکر مقصد میں کامیابی مشتبہ نظر آرہی ہے ۔ لوگ سیاسی شکار کھیلنے والوں کے داموں میں گرفتار ہو جاتے ہیں ۔ خود اپنے ملک کی سچی تاریخ سے واقف نہیں ہو سکتے ۔ تو تاریخ عالم کی پیچیدگیاں کیسے سمجھ سکیں گے ۔ قسمت نے برطانیہ کو اس کی برّی و بحری قوت اور معاشی اقتدار کی وجہ سے بین الاقوامی دنیا میں ممتاز مقام عطا کیا ہے جو درحقیقت ایک بڑی بھاری ذمہ داری ہے ۔ اس لیئے عالمگیر فلاح اور سچی تہذیب کے برقرار رکھنے کے لیئے ضروری ہے کہ تمام مدارس

میں اخلاقیات مبادیات سائنس، اصول حفظان صحت انسانی ارتقا معاشرتی نشو و نما جغرافیہ
عالم اور صحیح تاریخ (علی الخصوص تاریخ جدید) اور اسکے رجحانات کی تعلیم کا باضابطہ انتظام کیا
جائے۔ متعدد برطانوی مبصرین کا خیال ہے کہ حالیہ طریقہ تعلیم کی وجہ سے ان کے
ملک کے بڑے یعنی ذی اقتدار آدمی ملک کی مجموعی آبادی کے صرف ۵ فیصد افراد میں سے ہی منتخب
ہو سکتے ہیں۔ بقیہ ۹۵ فیصد کو آگے بڑھنے کا موقعہ نہیں دیا جاتا۔ اس لیے نہ تو زندگی کی ضروریات
سے وہ اچھی طرح آگاہ ہیں اور نہ فرصت کے صحیح استعمال سے۔ زندگی کے کاروبار ایک محدود
دائرہ میں چکر لگاتے ہیں اور فرصت کے اوقات طفلانہ لہو و لعب یا نیوز آف دی ورلڈ
جیسے اخبارات کی (جس کی خریداری چالیس لاکھ تک بڑھ گئی ہے) عموماً سنسنی خیز بیہودہ
خبروں اور اشتہاروں کے مطالعہ میں رائگاں جاتے ہیں۔ دولتمندوں کی فرصت اس سے
زیادہ تفریح اور مضر کاموں پر قربان کی جاتی ہے۔ ان تمام نقائص کا واحد علاج لیبرل
( Liberal ) ایجوکیشن یعنی فیاضانہ یا غیر خود غرضانہ تعلیم ہے۔ محض فنی یا پیشہ
وری تعلیم نہیں۔

ارسطو اور افلاطون دونوں کی رائے میں "لیبرل" تعلیم سے مراد ایسی تعلیم ہے
جو انسان کو نہ صرف اسکی خواہشات نفسانی پورا کرنے میں مدد دیتی ہے بلکہ ذہنیت کی
صحیح تعلیم بھی اس میں شامل ہے۔ جس کے لیئے ضروری ہے کہ عقل ( Intellect )
کو ضوابط و قواعد کے تابع رکھ کر پھلنے پھولنے کا موقعہ دیا جائے۔ عقل کی تربیت کے
ساتھ حواس ( Senses ) کی تربیت اور جذبات غیر توقّتی ( Emotions )
کی تربیت بھی لازمی ہے۔ عقل حیوانی تمام جانداروں کو سامان خور و نوش اور ذاتی
آرام و آسایش بہم پہنچانے کی حد تک ہی مدد دیتی ہے۔ انسانیت ان سے بالاتر چیز ہے
اس کے لیئے باقاعدہ تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے۔ انہی وجوہ کی بناء پر ارسطو کہتا ہے
کہ بچہ کے سب سے پہلے اخلاق و عادات درست کیئے جائیں۔ اس کے بعد عقل کی
تربیت خود بخود ہو جاتی ہے۔

تعلیم فی الحقیقت زندگی کے ان تمام انکشافات کا لُبّ لباب ہے جن کی بدولت آدمی بہیمیت چھوڑ کر انسانیت سیکھا ہے۔ ہزاروں سال کے تجربوں کے تلخ و شیریں نتائج تھوڑی سی مدت میں کسی بچہ کو معلوم کرانا آسان کام نہیں۔ بہت کم بچوں کو ان سے واقف ہونے کی فطرۃً رغبت ہوتی ہے۔ اسی لئے ماں باپ اور استاد کو چاہیئے کہ بچوں کو حکماً پہلے ان امور سے آگاہ کرا دیا جائے۔ اس آگاہی کی ضرورت کا ان کو آگے چل کر خود بخود علم ہو جائے گا۔ جب بچہ اپنے بہی خواہ نیک بزرگوں کی بہ طیب خاطر اطاعت کرنے لگتا ہے تو اس کے لئے ترقی کا راستہ صاف ہو جاتا ہے اور وہ بھٹکنے نہیں پاتا۔ محض مادّی نقطہ نظر سے اس مسئلہ پر غور کرنا ناکافی ہے۔ مذہب کا نصب العین مادّی فلاح و بہبود سے بدرجہا بلند تر ہے۔ احکام الٰہی کی مدد سے جب اچھائی اور برائی میں امتیاز کیا جاتا ہے تو دنیا کا صحیح تر تصور پیدا ہوتا ہے اور زندگی کے بہتر طریقے دکھائی دیتے ہیں اور آدمی انفرادی و اجتماعی حیثیت سے صحیح تعلیم و تربیت کی طرف راغب ہو کر دنیا میں امن و راحت پھیلانے کی کوشش کرتا ہے۔

افلاطون کی تصنیف ریپلک ( Republic ) میں اچھے تعلیم یافتہ انسان سے ایسا شخص مراد ہے جو آدمی کے بنائے ہوئے معیوب اور فطرت کے اگائے ہوئے ناقص اشیاء کو فوراً پہچان لے، اوائل عمر ہی سے معائب کو ناپسند کرے اور حسن سے محظوظ ہو کر اس کو اپنے دل و جان کا جزو بنائے اور اس سے پرورش پائے۔ جذبات غیر قوتی کو اسی غرض و غایت کے لئے تربیت دینی چاہیئے۔

مفکران عصر جدید کی رائے میں انسان کو اپنے ارتقا کا بھی حق حاصل ہے۔ لیکن اگر ذرا غور سے سوچا جائے تو مذہب کی صحیح تعلیم پر عمل کرنے سے انسان میں یہ تمام خوبیاں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس کا بہترین ارتقا اس میں ہے کہ از روئے عقیدہ بعد از مرگ آنیوالی دنیا میں اسکو مقام عزت حاصل ہو۔ اس ارادہ کے تحت اسکو دنیا میں بھی اچھے سے اچھا ارتقا نصیب ہو سکتا ہے۔

انسان میں چند امتیازی خصوصیات ہیں۔ ارسطو کہتا ہے کہ وہ ذی عقل و باشعور

حیوان ہے۔ قدرت سے اسکو نفس یا ذہن عطا ہوا ہے جس کی مدد سے وہ سوچتا، واقعات کے اسباب دریافت کرتا، ان کے وجوہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے، فطرت کے راز منکشف کرنا چاہتا، آئندہ کے لئے قبل از قبل انتظام کرتا اور اغراض و منشاء زندگی پر غور کرتا ہے۔ انسان صرف نظری استدلال ہی کے تحت کسی امر کو محض جاننے کی خاطر نہیں جانتا ہے بلکہ اپنے علم کو عملی جامہ بھی پہناتا ہے۔ یعنے اس سے مفید کام لیتا ہے اس خاصیت کے تحت اس نے دنیا میں بہت ردّ و بدل کئے۔ انسان کے سوا ہر شئے یا جاندار سے جو عمل سرزد ہوتا ہے اس کا خود اختیاری نہیں بلکہ محض مقتضائے طبیعت ہے۔ انسان ہی نیک و بد کا تصوّر سامنے رکھ کر کام کرتا ہے یعنے جن باتوں کو وہ برا سمجھتا ہے ان سے احتراز کرتا ہے اور جن کو اچھا سمجھتا ہے انکو اختیار کرتا ہے۔

برطانیہ کے طریقہ تعلیم کا خاکہ اس طرح کھینچا گیا ہے کہ وہاں تعلیم کے دو راستے ہیں۔ بہتر راستہ بچوں کو نرسری، کنڈرگارٹن، پھر دس برس کی عمر میں پرائمری اسکول پھر پبلک اسکول۔ اسکے بعد اٹھارہ برس کی عمر میں آکسفرڈ، کیمبرج (یا بعضوں کی رائے میں ایڈنبرا) کی جامعات میں سے جاکر، بیس سال کی عمر میں دولتمند پیشوں اور حکومت کے تمام دروازوں کو ان کے لئے کھول دیتا ہے۔

آکسفرڈ کی جامعہ بارھویں صدی عیسوی میں قائم ہوئی کیمبرج کی تیرھویں صدی میں اور ایڈنبرا کی ۱۵۸۲ء میں۔ سچ پوچھو تو یورپ کی سب سے قدیم جامعہ قرطبہ (اسپین) کی ہے جس کو مسلمانوں نے دسویں صدی کے وسط میں بڑے ہی تزک و احتشام سے قائم کیا تھا۔ اسمیں مسلمان یہودی اور عیسائی بلا لحاظ ملک و ملت تعلیم پاتے تھے۔ عیسائی یورپ میں بولانیہ ( Bologna ) کی جامعہ گیارھویں صدی میں مسلمانوں کی تقلید میں قائم ہوئی۔ اس کے بعد پیرس کی جامعہ۔ لندن کی جامعہ ۱۸۲۸ء میں ڈرہم کی ۱۸۳۲ء میں منچسٹر کی ۱۸۸۰ء میں، برمنگھم ۱۹۰۰ء میں اور لیورپول ۱۹۰۳ء لیڈز ۱۹۰۴ء شیفیلڈ ۱۹۰۵ء میں۔ امریکی جامعات کا قیام آکسفرڈ و کیمبرج کے بعد مگر برطانیہ کی دوسری جامعات سے پہلے ہوا۔

ہارورڈ ۱۶۳۶ء میں ییل ( Yale ) سنہ ۱۷۰۱ء میں پرنسٹن ۱۷۴۶ء میں اور کیلیفورنیا ۱۸۶۸ء میں۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے زیر اثر کلکتہ بمبئی اور مدراس کی حالیہ جامعات ۱۸۵۷ء میں قائم ہوئیں۔] یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ ایشیا میں مغربی طرز کی پہلی جامعہ کا افتتاح منیلا ( Manila ) جزائر فلپائن میں سولھویں صدی میں ہوا۔ جزائر فلپائن پر پرتگال کا اثر ۱۵۸۰ء میں مستحکم ہوا جب کہ اسپین اور پرتگال ایک تاج کے تابع ہوئے۔ اسکو بھی اندلس کے عربوں کے علمی ترکہ کا نتیجہ سمجھنا چاہئے۔

برطانوی تعلیم کا دوسرا راستہ پرائمری مدرسہ سے شروع ہوتا ہے۔ طلباء کو گیارہ برس کی عمر میں سینیر اسکول (جو اکثر پرائمری کی بالائی جماعتوں تک ہی محدود رہتے ہیں) اور بعض صورتوں میں ثانوی مدرسہ سے (جو صرف انھیں کے لئے ممکن ہیں جن کی فیس تعلیمی معاف ہوتی یا جن کو وظیفہ ملتا ہے یا متمول والدین کی اولاد ہیں) لیکر گزرتا ہے۔

اس دوسرے راستہ سے پہلے راستہ تک رسائی ثانوی مدرسہ کے توسط سے ممکن ہے لیکن صرف دس فیصد یا زیادہ سے زیادہ بیس فیصد طالب علم ہی اسکو عبور کر سکتے ہیں۔ باقی سبھوں کو اندنوں ۱۴ برس کی عمر کے بعد محنت و مشقت کی ملازمت ہی کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑتا ہے۔ بالفاظ دیگر پہلے راستہ سے گزرنے والے بچے آگے چل کر حکمراں بنتے ہیں اور دوسرے راستے سے گزرنے والے مزدور پیشہ۔

اسی وجہ سے برطانیہ کے باشندوں میں قوت و اقتدار کی تقسیم نہایت ہی غیر مساوی ہے مسٹر جے۔ ایف راس نے اپنی کتاب پارلیمنٹری ریپریزنٹیشن (پارلیمنٹ میں نمائندگی) میں ۱۹۳۵ء کے برطانوی دار العوام کی رکنیت کے متعلق بتایا ہے کہ مجموعی آبادی کے دو فیصد پبلک اسکولوں کے تعلیم یافتہ پانچ فیصد ثانوی مدارس کے، اور ۹۳ فیصد ایلمنٹری مدارس کے تعلیم یافتہ اشخاص میں سے علی الترتیب ۵۶ فیصد ۲۱½ فیصد اور ۲۲½ فیصد کا پارلیمنٹ کی رکنیت پر انتخاب عمل میں آیا۔ گزشتہ دو عالمگیر جنگوں کے مابین چھ کنزرویٹیو ( Conservative ) ارکان پارلیمنٹ کا تقریباً چوتھائی جزو ایٹن ( Eton ) کے طلباء پر مشتمل تھا اور تہائی

جز وایٹن یا ہیرو ( Harrow ) کے طلبا پر۔ ہاؤز آف لارڈز کے ۶۰ فیصد ارکان ایٹن ہی کے تعلیم یافتہ ہیں افسوس اس بات کا ہے کہ ارباب تنقید کی رائے میں بہتر راستے سے گزرنے والوں کا مابہ الامتیاز ان کی دماغی خوبی ذہنی قوت یا تعلیم سے مستفید ہونے کی قابلیت نہ تھا۔ بلکہ محض تمول۔ چونکہ آبادی کے ۸۰ فیصد افراد کو ۱۴ برس کی عمر کے بعد کسی مدرسہ کی باضابطہ تعلیم نصیب نہیں ہوئی اسلئے اس بڑی جماعت میں جو چھپے ہوئے دماغی جوہر تھے وہ پہچانے ہی نہیں گئے چہ جائے کہ ان سے استفادہ کیا جاسکے۔ ایک برطانوی بزلہ سنج ظریف کا مقولہ ہے کہ ایسی حالت میں تعجب نہیں کہ آکسفرڈ و کیمبرج دارالعلوم کہلائیں کیونکہ انمیں داخلہ کے وقت اتنے بہت امیدوار تھوڑا سا علم اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور جب نکلتے ہیں تو اتنے کم لوگ اپنے ساتھ علم لے کر نکلتے ہیں۔" ڈزریلی کے دو اقوام والے نظریہ کے لحاظ سے ہر تیس آدمیوں میں صرف ایک پہلے راستہ سے گزرتا ہے اور باقی ۲۹ دوسرے راستہ سے۔

# دولت کی غیر مساوی تقسیم

دولت یا تمول کی غیر مساوی تقسیم پر نظر ڈالی جائے تو سر جان آر ( Orr ) کی تصنیف غذا، صحت اور آمدنی کے بموجب ۱۹۳۸ء میں برطانیہ کا اسّی فیصد سرمایہ چھ فیصد آبادی میں مرکز تھا۔ ۱۹۳۵ء میں انگلستان کے ۸ ½ لاکھ افراد کی آمدنی فی کس ۵۰۰ پونڈ سالانہ تھی جن میں سے صرف چھ ہزار کی آمدنی فی کس بیس ہزار پونڈ سالانہ تھی۔ انمیں سے ۲۹۷ کی فی کس ایک لاکھ پونڈ سالانہ تھی مزید تفصیل میں جائیں تو ۱۷۹۹ ایسے تھے جو فی کس سالانہ ایک لاکھ ۸۵ (پچاسی) ہزار آمدنی کے مالک تھے۔ دو کروڑ ۲۷ لاکھ افراد فی کس یا پانچ سو پونڈ سالانہ سے کم کماتے تھے انمیں ۲۵۰ پونڈ سالانہ سے زائد آمدنی والے ۲۷ ½ لاکھ آدمی تھے ڈھائی سو اور ڈیڑھ سو پونڈ سالانہ کے مابین آمدنی والے ۴۱ لاکھ تھے۔ ایک کروڑ ۵۹ لاکھ کی آمدنی فی کس

ڈیڑھ سو پونڈ سالانہ (یعنے تین پونڈ فی ہفتہ) سے کم تھی اور انہیں ۷۵ فیصد یعنے ایک کروڑ ۲۰ لاکھ نفر ایک سو بائیس پونڈ سالانہ سے کم پاتے تھے۔ تمول کے ساتھ سیاسی اقتدار کی تقسیم بھی اسی کے مماثل تصور ہو سکتی ہے۔

ان اعداد و شمار سے صرف یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ سرمایہ داری کے قدیم رسم و رواج یا ابتدائی تاریخی روایات و مزید برآں ہندوستان و دیگر مقبوضات سے آسانی کے ساتھ حاصل کی ہوئی دولت کے برکات کے تحت برطانیہ میں (جیسا کہ دنیا کے اور ممالک میں عموماً دیکھا جاتا ہے) دولت و اقتدار کی نہایت نامساوی تقسیم ہوئی ہے اور باوجود اشاعت تعلیم مدارس میں شرکت کے قواعد اور تعلیم کے مروجہ طریقے کچھ ایسے واقع ہوئے ہیں کہ دولت و اقتدار کی تقسیم آیندہ بھی ایسی ہی رہے گی۔ یا ممکن ہے کہ اس سے بدتر ہو تی جائے گی۔ ملک کا ایک بیدار طبقہ ان نقائص کو دور کرنے کی کوشش کر رہا ہے کیوں کہ موجودہ زمانہ میں کسی ملک کی ترقی یا مرفہ الحالی کا اندازہ اس کے تمام افراد کی اوسط حالت سے کیا جا سکتا ہے نہ کہ کسی ممتاز جماعت یا طبقہ کی حالت سے۔ بین الاقوامی دنیا سرعت کے ساتھ تعلیم میں ترقی کر رہی ہے کوئی ملک علم کی اس دوڑ میں پیچھے رہ کر سنبھل نہیں سکتا۔ دولت و اقتدار کی مناسب تقسیم اشتمالیت کے اصول رائج کرنے سے نہیں ہو سکتی۔ سنجیدہ طریقہ تعلیم ہی سے اسکو عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے۔

## پبلک اسکولز

اب ہم برطانیہ کے مختلف تعلیمی اداروں کا مختصر حال بیان کرنا چاہتے ہیں تاکہ قارئین کو وہاں کی خصوصیات کا صحیح اندازہ ہو سکے اور ان کو پیش نظر رکھ کر مبصرین ہمارے ملک کی تعلیم کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کر سکیں۔ سب سے پہلے برطانوی پبلک اسکولوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ راقم الحروف کو اس معاملہ میں آکسفرڈ و کیمبرج کے تعلیم یافتہ انگریزیا ماہر تعلیم سے بالمشافہ تبادلۂ خیالات اور مطبوعہ مستند تحریرات کے مطالعہ سے جو مستند

حاصل ہوئیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ برطانیہ کا سب سے قدیم پبلک مدرسہ ونچسٹر کا ہے جس کو ولیم آف وائیکہم ( Wykeham ) نے ۱۳۸۴ء میں قائم کیا۔ ونچسٹر ہمپ شائر ( Hampshire ) میں واقع ہے۔ شاہ الفریڈ اور کینوٹ کے زمانہ میں ملک کا پایۂ تخت تھا۔ اس مدرسہ کی عمارتیں بہت خوبصورت ہیں۔ اور باغ بھی نہایت پر فضا ہے۔ ایٹن ( Eton ) کا پبلک مدرسہ ۱۴۴۰ء میں دریائے ٹیمز پر ونڈزر ( Windsor ) کے قریب قائم ہوا۔ اس کا بانی بادشاہ انگلستان ہنری ششم ہے۔ سربرآوردہ طلبائے ایٹن کی اعلیٰ علمی سیاسی و قومی خدمات کی وجہ سے اس مدرسہ کو عرصہ دراز سے تمام مغربی مدارس میں سب سے زیادہ شہرت اور امتیاز حاصل ہے۔ قدامت کے لحاظ سے اس کے بعد شروزبری ( Shrewsbury ) کا نمبر آتا ہے جو ایڈورڈ ششم کے زمانہ میں دریائے سیورن ( Severn ) کے بازو تعمیر کیا گیا۔ اس کے طلباء کی تعداد ۵۴۰ ہے۔ ویسٹ منسٹر اسکول ۱۵۶۰ء میں قائم ہوا۔ ملکۂ ایلیزبیتھ نے اس سال وہاں کے سابقہ رہبانی ادارہ ( سینٹ پیٹرس کالج ) کو نئی تشکیل دی اس کے چالیس کنگس اسکالروں کو شاہان انگلستان کی تاجپوشی کے جلسوں اور پارلیمنٹ کے مباحثوں میں شرکت کا امتیازی حق حاصل ہے اسمیں صرف ۳۶۰ لڑکوں کے رہایش و تعلیم کا انتظام ہے۔ رگبی ( Rugby ) کا پبلک مدرسہ وارک شائر ( Warwickshire ) میں ۱۵۶۷ء میں قائم ہوا۔ لارنس شیرف ( Lawrence Sheriff ) اس کا بانی تھا۔ ٹھامس آرنولڈ ( ولادت ۱۷۹۵ء ) کے زمانہ صدر مدرسی ( از ۱۸۲۷ء تا ۱۸۴۲ء ) میں اسکو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ ہیرو ( Harrow ) کا مدرسہ لندن کے قریب ہیرو۔آن۔دی ہل پر ۱۵۷۱ء میں قائم ہوا۔ اس کا بانی جان لیئون ( John Lyon ) ہے۔ اسمیں ۶۵۰ لڑکوں کی رہایش اور تعلیم ہوتی ہے۔ چارٹر ہوس ۱۶۱۱ء میں قائم ہوا۔ اس کے نام سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے ایک کارتھوسین موناسٹری ( Monastery ) شہر لندن میں بوڑھوں کی رہائش اور لڑکوں کی تعلیم کیلئے

قائم تھی بعد کو وہاں یہ مدرسہ اسکے اوقاف سے بن گیا۔ لندن سے اُٹھ کر گوڈامنگ (Godalming) میں ۱۸۳۶ء میں منتقل ہوا۔

پبلک اسکولوں کے ۱۸۶۴ء والے ایکٹ کی رو سے ان سات اسکولوں کے علاوہ مندرجہ ذیل پبلک مدارس قائم ہیں:۔ سینٹ پال کا مدرسہ لندن میں قریب محلہ ہمرسمتھ (Hammer Smith) بانی سینٹ پال کی کتھیڈرل کا ڈین کولے (Dean Colet) اور تاریخ قیام ۱۵۰۹ء ہے مرچینٹ ٹیلر کا مدرسہ بانی مرچنٹ ٹیلروں کی قدیم کمپنی، ۱۵۶۱ء میں قائم ہوا۔ پہلے سفک (Suffolk) اسٹریٹ لندن میں تھا ۱۸۷۵ء میں چارٹر ہوس کے خالی شدہ عمارات میں منتقل ہوا۔ پھر ۱۹۳۳ء میں سینڈی لاج (Sandy Lodge Heath) میں۔ ایکٹ مذکور کی رو سے کوئی بھی مدرسہ جو وقف کی آمدنی سے قائم ہے اور کسی شخص کی ذاتی جائداد نہیں یا حکومت کی نگرانی سے مستغنی ہے پبلک اسکول متصور ہو سکتا ہے بشرطیکہ اسکا ہیڈ مدرس ہیڈ ماسٹروں کی کانفرنس کا رکن ہو۔ تین اور پبلک اسکول بطور خاص قابل ذکر ہیں ریپٹن (Repton) ڈاربی کے قریب ۱۵۵۷ء میں قائم ہوا۔ اسمیں ۴۲۵ لڑکے پڑھتے ہیں۔ ویلنگٹن (Wellington) کالج پبلک اسکول کرو تھورن (Crowthorne Berks.) میں ڈیوک آف ویلنگٹن کی یادگار میں ۱۸۵۳ء میں قائم ہوا۔ اسمیں تقریباً چھ سو لڑکے رہتے اور تعلیم پاتے ہیں۔ میلورن (Melvern) کا مدرسہ ۱۸۶۲ء میں قائم ہوا۔

مندرجہ بالا تحریر سے واضح ہے کہ پبلک مدارس کا مابہ الامتیاز زیادہ تر ان کی قدیم روایات رہائش، تعلیم اور کھیل تفریح کا ایک ہی جگہ انتظام اور کیریکٹر (کردار) کی تربیت ہے۔ لڑکے مختلف "گھرانوں" (Houses) میں خاص خاص اُستادوں کے زیر نگرانی تقسیم کر دیے جاتے ہیں۔ ان اساتذہ کی نگرانی میں لڑکے خود اپنے خورونوش رہائش و تعلیم کھیل اور تفریح کا انتظام کر لیتے ہیں۔ انکو اپنے "ہوس" کی ناموری کا ہی خیال رہتا ہے۔ اپنی ذاتی ناموری کا نہیں۔ انہیں سے چند ایک مدارس آکسفرڈ اور کیمبرج سے بھی زیادہ

قدامت کے سمجھے جاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ جامعات مذکورانھیں مدارس کے سانچوں میں ڈھالی گئی ہیں۔ تعلیم مرکزی ہوتی ہے۔ کلاس واری نہیں۔ لڑکوں کو کافی آزادی حاصل ہے دارالمباحثہ میں معاشی معاشری تعلیمی اور حکومت کے سیاسی مسائل پر بھی بحث کی جاسکتی ہے جونیر (چھوٹے اور بعد کے آئے ہوئے) لڑکے بڑے اور پہلے سے شریک (سینیر) لڑکوں کا بہت احترام کرتے ہیں۔ انکو کھیل کے میدانوں سے بہ نسبت تعلیم کے کروں کے زیادہ دلچسپی اور انسیت رہتی ہے۔ اس قسم کی تربیت سے لڑکے میں اپنی ذات پر اعتماد، احساس خودی اور قیادت کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ لیکن بعض صورتوں میں قیادت کا جذبہ اسقدر بڑھ جاتا ہے کہ بڑے لڑکے خصوصاً وہ جو زیادہ تنومند طاقتور اور کھیل میں ممتاز ہوتے ہیں چھوٹے اور کمزور (یا خالص تعلیم کے دلدادہ) لڑکوں پر ظلم و تشدد کرتے ہیں جس کے لئے فیگنگ ( Fagging ) کا لفظ مستعمل ہے۔ انہی وجوہ سے اور ان مدارس کے بعض دوسرے پس پردہ عیوب کو پیش نظر رکھ کر واقف کار معترضین نے اس طریقہ تربیت کی سختی کے ساتھ عیب جوئی کی ہے۔ چنانچہ (W. A. H) سے منسوب کتاب ( Loom of Youth ) اور ایچ۔ جی۔ ویلز ( Wells. ) کی اسٹوری آف این ایجوکیشن ( Story of an Education ) میں ان پر برے حملے کئے گئے ہیں۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ پبلک اسکولوں کا اصل منشا لیڈری یا قیادت کی عملی تربیت ہے یہاں لڑکوں کا مطمح نظر زیادہ تر اپنی خداداد قوت، ذہانت و ہمت (غرض دل و دماغ کی خوبیوں) کے ذریعہ جائز طریقوں سے اپنے ساتھیوں پر تفوق حاصل کرنا ہے۔ اپنے ہم عمروں کو منظم کرنا بحث مباحثہ میں افراط تفریط کو روکنا کھیل اور تفریح کی پارٹیوں کو باقاعدہ اور پسندیدہ طریقہ پر ترتیب دینا ہے۔ بعض اوقات کمزوروں اور مظلوموں کی فیاضانہ اعانت کا ذوق بھی اپنے کرشمے دکھاتا ہے۔ چونکہ ان لڑکوں کی عمر عموماً زمانہ بلوغ اور اسکے قریب کی ہوتی ہے اس عمر کی شوخی اُمنگ اور اولوالعزمی انسان کی

عمر کا بہترین عطیہ متصور ہوتی ہے۔ مدرسہ کی بے لوث پُرخلوص دوستیاں خواہ خالص لڑکوں کے مدرسوں کی ہوں یا خالص لڑکیوں کے مدرسوں کی بعض اوقات تمام عمر قائم رہتی ہیں بعد کو خواہ کتنا ہی اختلاف واقع ہو۔ مغربی دنیا کے ماہران تعلیم اس قسم کی تربیت کو گریک آئیڈیل ( Greek Ideal ) یونانی تصوّر یعنے صحت مند جسم میں صحت مند ذہن کا نشو ونما سمجھتے ہیں۔ لوئس ڈکنسن ( Loues Dickinson ) کی رائے میں "بیس برس کی عمر کا بُرے اثرات سے مصئون و مبرّا نوجوان جس کا ذہن شگفتہ ہو رہا ہے اور جس کے احساسات تمام تر بھلائی کی طرف مائل ہیں دنیا کی سب سے عمدہ اور احسن چیز ہے"۔ سچ پوچھو تو قیام تہذیب وتمدن سے تمام ممالک کے رہنمایان تعلیم اسی خیال کے زیر اثر "تربیت فرزند" کے کوشاں رہے ہیں۔ اگر پبلک اسکول اور اقامتی جامعات کا مقصد ایسے ہی صحیح قسم کے نوجوان پیدا کرنا ہے تو وہ وہی کام کرتے ہیں جو بہترین درسگاہوں کو کرنا چاہیئے۔ اکثر مدارس میں عیسوی مذہب کی عبادت گاہیں بھی تعمیر کی گئی ہیں۔ جہاں روزانہ صبح کے وقت یا صرف اتوار کو لڑکے جمع ہوتے ہیں۔ موسیقی (زیادہ تر ارگن باجہ) کے ساتھ جس ذوق سے مذہبی گیت گاتے ہیں ان کے متعلق جوڈ کہتا ہے کہ سننے والوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب بھی انگلستان میں عیسائی مذہب پر لوگوں کا دلی عقیدہ ہے۔ اگر ہر وقت نہیں تو گیت گانے تک ہی سہی۔

ان مدارس کے دوسرے پہلو پر بھی نظر ڈالنی چاہیئے۔ برطانیہ کا ایک ممتاز طبقہ ان مدارس کو ( Snob Factories ) (خود پرستی اور سفلہ پروری کے صنعت گھر) قرار دیتا ہے۔ مسٹر ٹالبائز ( Talloys ) اپنی کتاب "اے وکٹورین اسکول" ( A Victorian School ) میں ویلنگٹن کے پبلک مدرسہ کے (جہاں وہ طالب علم اور بعد کو تاحیات مدرس رہا) اس رُجحان کی نکتہ چینی کرتا ہے۔ مسٹر ریمنڈ مورٹمر ( Raymond - Mortimer ) نے بھی اپنے مدرسہ ( Melvern ) میلورن اسکول کا ذکر کرتے ہوئے اسی قسم کا اعتراض کیا ہے۔ انکی دانست میں یہ مدارس آمریت کے گہوارے ہیں۔ اگر زندگی کا منشاء ہمیشہ جنگ کے لیئے تیاری کرنا، کھیلوں میں امتیاز حاصل کرنا اور لوگوں پر حکمرانی

کرنا ہے تو پبلک اسکول اس مقصد کو بخوبی پورا کرتے ہیں۔ لیکن اگر ان کے کام انجام دینے
اور ان کا لطف اٹھانے کی خاطر تعلیم دینا ہے تو پبلک اسکولوں سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔
ان مدارس میں شرکت کوئی آسان بات نہیں۔ لفظ پبلک سے یہاں عوام الناس مراد نہیں
ہے بلکہ وہ پرائیویٹ کی ضد بطور استعمال ہوتا ہے۔ عوام الناس کے بچوں کی ان مدارس تک
رسائی خواب و خیال سے بھی بعید تر ہے۔ خود انگریزوں کے بچوں کو یہاں داخل ہونے کیلئے
ذی اثر اشخاص کی پُرزور سفارش اور والدین کی کثیر دولت ناگزیر ہے۔ اسلئے ان میں بہت
کم لڑکے شریک ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ دوسری عالمگیر جنگ سے پہلے انگلستان
اور ویلز میں ساٹھ لاکھ طلباء کے منجملہ وہاں کے سربرآوردہ ساٹھ پبلک مدارس میں صرف
چھبیس ہزار طلباء ہی شریک تھے۔

برطانیہ کے باہر والوں میں سے زیادہ تر شہزادوں اور غیر معمولی دولتمندوں کے
خاص وضع قطع کے لڑکوں کو یہ موقع دیا جاتا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں برطانیہ کی حکومت نے
شاہ عراق کے لڑکے کو ایٹن ( Eton ) میں شریک کرایا۔ پرنس اکیکی۔ کے
نیوبونگو ( Akiki K. Nyobongo ) یوگانڈا ( Uganda )
استوائی افریقہ (قریب جبال القمر) کے شہزادے کی بچپن میں ییل ( Yale )
اور آکسفرڈ کی جامعات میں مکمل تعلیم ہوئی لیکن یہ امر واقعی ہے کہ واپسی کے بعد اس نے جو
کتاب "افریقہ آنسرز بیک" ( Africa Answers Back ) لکھی اس میں افریقی
طریقہ معاشرت اور ازدواجی زندگی ہی کو فوقیت دی ہے۔ برطانیہ کو اپنے پبلک
مدارس پر بہت ناز ہے اور یہ ناز اگر اس کی حکومت کے اکثر اعلے عہدہ داروں یا
دقیقہ رس عالموں اور محققوں کے گذشتہ چند صدیوں کے کارناموں کو پیش نظر رکھا جائے
تو بالکل بجا ہے۔ اس لئے کہ ان کا گہوارہ پبلک مدارس ہی تھا۔ ڈیوک آف ولنگٹن سے
منسوب یہ مقولہ کہ واٹرلو ( Waterloo ) کی جنگ ایٹن اور ہیرو کی بازی گاہوں
پر جیتی گئی مبالغہ نہیں ہے۔ برطانوی ڈسپلن ہی کی وجہ سے پہلی عالمگیر جنگ میں برنی اور

اس کے حلیفوں کو شکست ہوئی۔ ڈسپلن کا مفہوم حاکم مجاز کے احکام کی بے چون و چرا تعمیل ہے
ٹینی سن ( Tennyson ) نے اس پہلو کو اپنی مشہور نظم چارج آف دی لائٹ
بریگیڈ میں ناقابل فراموش طریقہ سے ظاہر کیا ہے۔ قدیم روما کے سپاہیوں کا بھی اسی طرح کا
ڈسپلن تھا۔ اور جب تک یہ ڈسپلن جاری رہا روما کی ریپبلک اور پھر اسکی ایمپائر باوجود ظلم و تشدد
برقرار رہی۔ لیکن جب عیسائیت کو فروغ ہوا تو یہ سلطنت پارہ پارہ ہوگئی۔ افسوس ہے کہ
مشرقی ممالک کے اکثر تعلیم یافتہ ڈسپلن کا صحیح مفہوم پانے میں قاصر ثابت ہوتے ہیں ایک ممتاز
ہندوستانی مقرر نے ڈسپلن کے متعلق صاف کہدیا ہے :۔

ع ۔ "یہ وہ ہے لفظ جو شرمندہ معنی نہ ہوا"

اس لیے کہ وہ یہ بتانا چاہتے تھے کہ چھوٹوں کے لیئے تو ناگزیر ہے کہ بڑوں کا حکم مانیں
لیکن بڑوں کے لیئے ضروری نہیں کہ چھوٹوں کا لحاظ کریں اور ان کی دقتوں کو رفع کرنے
کی کوشش کریں۔ حقیقت حال اس سے مختلف ہے۔ امن کا زمانہ ہو کہ جنگ کا پہلے حکم کی
تعمیل کی جانی چاہیئے پھر کام ختم ہونے کے بعد دستوری اور آئینی طریقہ کے تحت شکایات
یا عذرات پیش کئے جائیں۔ اسلام سب سے بالاتر حاکم یعنے اللہ تعالیٰ کے احکام بتاکر
چھوٹے اور بڑے سبھوں سے اطاعت کا طالب ہے۔ اسی لیئے خلافت راشدہ کا زمانہ
سچے ڈسپلن کا بہترین نمونہ تھا اور اس سے مسلمانوں کو امن اور جنگ دونوں صورتوں میں
جو حیرت انگیز کامیابیاں حاصل ہوئیں اس سے ہر شخص بخوبی واقف ہے۔ اکثر اقوام و ممالک
میں ڈسپلن کی کمی دیکھی جاتی ہے۔ اسی لیئے وہ مائل بہ زوال پذیر ممالک علی الخصوص مشرقی ملکوں
میں طوائف الملوکی چلی آرہی ہے۔ اسلامی تاریخ کے درخشاں زمانہ کو چھوڑکر (جو دراصل صحیح
ڈسپلن کا بے نظیر زمانہ تھا) بعد کے ادوار پر نظر ڈالی جاتی ہے تو ہر طرف مسلمہ حکومت
سے دیدہ و دانستہ کھلی بغاوت، بیٹے کی باپ سے جنگ، بھائی بھائی کا تخت و تاج کیلئے
لڑمرنا روزمرہ کے واقعات دکھائی دیتے ہیں۔ جنکی وجہ سے مسلمان شاہی خاندان جلد
جلد بدلتے گئے اور بالآخر سلطنتیں ٹوٹ پھوٹ گئیں۔ مٹ گئیں یا نہایت کمزور ہوگئیں۔

مشرقی ممالک میں لوگ عموماً اپنے آقا، سرپرست یا محسن سے قبل از وقت اسکی جگہ لینے کے
خاطر غداری اور کھلی عداوت برتتے ہیں۔ اس کے برعکس پبلک اسکولوں کی تربیت یہ سکھاتی
ہے کہ ہم رتبہ و ہم مسلک رفیقوں اور ساتھیوں ہی میں سے منتخب کیے ہوئے مسلمہ امتیاز کے
حامل افراد کے ساتھ بھی کامل وفاشعاری اور ان کے احکام کی قطعی تعمیل کی جائے۔ پس
اس سے بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ محض دنیاوی کاروبار کی حد تک پبلک اسکول کا ڈسپلن
(خواہ وہ کمتر عمر والوں اور کمزور رفیقوں کے حق میں جابرانہ ہی کیوں نہ ہو) نظم قائم رکھنے
میں کس طرح کامیاب ثابت ہوتا ہے۔

جب کبھی پبلک اسکولوں میں مدرسی کی کوئی جگہ تقرر طلب ہوتی ہے تو عموماً ٹائمز
(Times) کے ایجوکیشنل سپلیمنٹ میں اشتہار دیا جاتا ہے اور ایک بڑی جماعت
فارغ التحصیل نوجوانوں کی ضروری اسناد اور حوالوں کے ساتھ درخواستیں پیش کرتی ہے
لیکن سب جانتے ہیں کہ تقرر صرف اسی کا ہوتا ہے جو ہیڈ ماسٹر متعلقہ یا مجلس انتظامی کے
کسی سربرآوردہ رکن کے پسندیدہ معیار میں پورا اترتا ہے۔ یہ معیار علمی قابلیت، سابقہ
کارگزاری یا تحقیقاتی کام سے اتنا مربوط نہیں ہے جتنا کہ اس زمرہ کے اطوار و عادات
طریقہ معاشرت کے ساتھ وابستہ ہے۔ جوڈ (جو خود ایک پبلک اسکول اور پھر بیلیّل
(Balliol) کالج آکسفرڈ کا بلحاظ تعلیمی نتائج ایک ممتاز طیلسانی تھا اور علمی دنیا
میں اچھی شہرت رکھتا ہے، پبلک اسکول کی مدرسی سے مشرف نہ ہو سکا) کسی قدر دل جلے
الفاظ میں کہتا ہے کہ انتخاب امیدوار کی انداز نظر، بات چیت کے لہجے، جلد کی خوش رنگی
مزاج کی شگفتگی حتیٰ کہ تمباکو کی پائپ منہ میں اور تھیلی جیب میں رکھنے کے خاص طریقے،
کھیل کود میں پھرتی وغیرہ ایسی ہی۔ عوام الناس کی نظروں میں یہ چھوٹی مگر اس پیشہ کے
نقادوں کی رائے میں بہت اہم باتوں کے لحاظ سے عمل میں آتا ہے۔ پبلک اسکول میں
ایک بار مدرس مقرر ہو جانے سے معاشرتی، ترقی اور سماجی خوش حالی کے راستے
ہمیشہ کے لیئے کھل جاتے ہیں۔ ایٹن اور ونچسٹر کی خدمات کے لیئے اشتہار بھی نہیں دیئے

جاتے ۔ واقف کار ذی اثر اشخاص کی باہمی گفت وشنید پر ہی انتخاب عمل میں آتا ہے ۔ اس لیئے
پبلک اسکول کے مدرسین کی گویا ایک ملت ہی علیحدہ قائم ہوگئی ہے ۔ [چونکہ پبلک اسکول برطانوی
طرز معاشرت اور قومی وقار کی جان سمجھے جاتے ہیں اس لیئے کیا عجب کہ اساتذہ کے انتخاب
میں برسوں کے آزمودہ اور روایاتی طریقے ہی استعمال کئے جائیں۔ تعلیم مختصراً نوجوان کی
فطری خوبیوں کو ابھارنا ہے ۔ استاد کے ہدایات کی ضرورت سے زیادہ محتاجی نوخیز
طالب علم کیلئے اتنی ہی نامناسب ہے جتنی اسکی مطلق العنانی ۔ طلباء کے دلوں میں استاد کا وقار
اور محبت کے ساتھ خوف ہونا نہایت ضروری ہے ۔ نوجوانوں کے نقطہ نظر سے استاد کے
وضع قطع، طریقہ کلام، اطوار وعادات میں گرفت یا ہنسی کے قابل کوئی بات نہ ہونی چاہیئے
ورنہ لڑکے اس کا مذاق اڑانے لگتے ہیں اور جبر وتشدد سے بھی کام نہیں سدھر سکتا۔ پبلک
مدارس کی بھلی بری جو بھی خصوصیات ہیں ان کو برقرار رکھنے کے لیئے کیا عجب کہ اساتذہ کے
انتخاب کے مروجہ طریقے ہی بہترین سمجھے جائیں ۔]

## برطانیہ کے دیگر مدارس کے حالات

برطانیہ کے دیگر مدارس کے اساتذہ کو بڑی سختیاں جھیلنی پڑتی ہیں ۔ سچ پوچھو تو تمام دنیا
کے چھوٹے مدرسین کے نصیب میں مشقت وفلاکت ہی لکھی گئی ہے ۔ ان کی پرایثار خدمات سے
تمام دنیا فائدہ اٹھاتی ہے لیکن نہ ان کی جیسی چاہیئے عزت کی جاتی ہے اور نہ محنت کا ان کو
مناسب مالی معاوضہ دیا جاتا ہے ۔ انگلستان میں مزدور پیشہ ان سے زیادہ کماتے اور بہت
زیادہ خوشحال ہیں ۔ مذہب اسلام میں علماء کا بڑا احترام ہے اور استاد کا درجہ ماں باپ
کے مماثل قرار دیا گیا ہے ۔ اسی لیئے مسلمانوں کے درخشاں اور اسلامی دور میں علماء
کے لیئے حکومت کے بڑے سے بڑے عہدے مثلاً قضاوت وزارت وغیرہ محفوظ تھے
معلم کی ہر جگہ عزت تھی ۔ لیکن اسلامی طریقہ زندگی جوں جوں دنیا سے اٹھتا گیا استاد کی عزت

بھی گھٹتی گئی۔ اب جو حالت ہے محتاج بیان نہیں۔ لیکن بیسویں صدی میں سعادتمند انگریز شاگرد اپنے استادوں کا کافی احترام کرتے ہیں۔ چنانچہ آج سے چند ہی سال قبل ایک علمی بحث جو نیچر ( Nature ) کے مشہور رسالہ میں پروفیسر سر آرتھر ایڈنگٹن ( Eddington ) پلومین پروفیسر ہیئت کیمبرج اور ان کے ایک سابق شاگرد پروفیسر ای۔ اے۔ ملنے ( Milne ) راؤس بال ( Rouse Ball ) پروفیسر ریاضی آکسفورڈ کی کھلی مراسلت اسکی شاہد ہے۔ ملنے نے ایڈنگٹن کو اپنا استاد مان کر اپنی نسبت جو غلط فہمی پیدا ہوئی تھی اسکو نہایت سعادتمندانہ طریقے سے دور کیا جو ایک قابل یادگار واقعہ ہے۔ کاش کہ دور حاضر کے مشرقی دنیا کی مغربی طرز کے تعلیم یافتہ اس سے سبق سیکھتے۔

ایلیمنٹری مدارس کے اساتذہ غریبوں کی اولاد ہوتے ہیں۔ جن میں کسی مفید پیشہ کی باضابطہ تعلیم دلانے کی استطاعت نہیں۔ بچہ ذہین اور اس کا تعلیمی ریکارڈ اچھا ہوتا ہے۔ لیکن بجز و معاش والدین اس کی مدد نہیں کر سکتے۔ حکومت کو کم تنخواہ پر بڑی تعداد میں چھوٹی جماعتوں کی تعلیم کے لئے مدرس مامور کرنا ضروری ہے۔ اس لئے ایسے ہونہار بچوں کو ٹیچرس ٹریننگ کالج میں شریک کرا دیا جاتا ہے۔ جہاں تعلیم اقامتی اور سالانہ ایک سو پونڈ فیس کا نصف حصہ بورڈ آف ایجوکیشن ادا کرتا ہے۔ باقی نصف کا بڑا حصہ معہ دیگر ضروری اخراجات مقامی متعلقہ ادارہ بطور قرضہ دیتا ہے اس شرط پر کہ بعد تکمیل تعلیم طالب العلم مدرسی کی خدمت انجام دے۔ اور اپنی تنخواہ سے باقساط پھیر دے۔ ایسے ٹریننگ کالج کا کورس دو سال کا ہوتا ہے۔ یہاں فن تعلیم سکھایا جاتا ہے اور اسکے ساتھ کچھ جامعی تعلیم کا بدل بھی۔ مدرسین کو یونیورسٹی ٹریننگ ڈپارٹمنٹ میں بھی تعلیم دلائی جاتی ہے۔ اکثر جامعات کے ساتھ ایک ایسا ٹریننگ کالج ہوتا ہے جہاں جامعہ کے تین سال کی تعلیم ختم کر کے طالب علم ایک سال فن تعلیم سیکھتے ہیں۔ اور عام طور پر ڈگری اور سند لیکر ثانوی مدارس کے مدرس بنتے ہیں۔ ان کی حالت نسبتاً اچھی ہوتی ہے۔ لیکن ٹیچرس ٹریننگ کالج کے تعلیم یافتہ مدرس بڑی تکلیف اٹھاتے ہیں۔ ایلیمنٹری مدارس کے اسی فیصد استاد ایسے ہی کالجوں سے نکلتے ہیں۔

ان کو سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں نوکر ہو جانا پڑتا ہے۔ انکی زندگی (خواہ وہ مرد ہوں یا عورت) بڑی مفلسی اور بے سروسامانی کی ہوتی ہے۔ برے ماحول کے اثرات کے تحت صحت خراب وضع قطع بھونڈی لباس بوسیدہ۔ دیکھتے ہی پہچان لئے جاتے ہیں کہ کس پیشہ سے انکا تعلق ہے۔ گویا ان کی ملت ہی ایک جداگانہ ہے۔ موسمی تعطیلات سے مستفید ہونے کی وجہ سے کسی قدر حالت سنبھل جاتی لیکن سیر و سیاحت کے لئے ان کے پاس پیسہ نہیں ہوتا اور نہ کوئی ان ہی جیسے ایلمنٹری اسکول کے مدرسین کے سوا ان کے ساتھ میل جول یا ملاپ رکھنا چاہتا ہے۔ وقت واحد میں وہ لوگوں کی نظروں میں اپنے افلاس کے باعث حقیر ہیں اور موسمی تعطیلات کے باعث محسود۔ ان کی تنخواہوں کی تفصیل میں جانا بے سود ہے۔ صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ دوسری عالمگیر جنگ سے پہلے ایلمنٹری مدرسہ کی استانی ۱۵۰، ۱۸۰ پونڈ سالانہ سے شروع کرکے ۲۵۸ یا ۳۳۴ پونڈ تک پہنچ سکتی تھی۔ چالیس برس کی ملازمت کے بعد ساٹھ سال کی عمر میں نصف تنخواہ وظیفہ حسن خدمت پا سکتی تھی۔ (صدر معلمہ کو ۳۰۰ یا ۳۶۰ پونڈ تک بھی مل سکتے ہیں۔) مرد استاد سالانہ ۱۷۰ یا ۱۹۰ پونڈ سے شروع کرکے ۳۳۰ پونڈ یا کبھی ۴۱۰ تک ترقی کر سکتا ہے (صدر مدرس ۴۶۰ یا ۵۹۷ پونڈ سالانہ تک بھی)۔

ان اعداد و شمار سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ معیار زندگی اور معاشی حالت کے اختلافات کے باوجود بھی ہندوستان کے غریب چھوٹے مدارس کے استادوں اور استانیوں پر کیا مصیبتیں گزرتی ہوں گی۔ جوڈ نے انگلستان کے اس طبقہ مدرسین کی اصلاح حالت سے متعلق جو تجاویز پیش کئے ہیں ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:-

گزشتہ جنگ سے پہلے برطانیہ کے پرائمری مدارس میں تقریباً ایک لاکھ ۷۰ ہزار مدرسین پڑھایا کرتے تھے۔ ٹیچرس ٹریننگ کالجوں سے سالانہ ۷۰۰۰ (سات ہزار) مدرس نکلتے تھے جن میں سے دو تہائی عورتیں تھیں۔ ان کے علاوہ ثانوی مدرسوں میں ۲۵ ہزار مدرس پڑھاتے تھے۔ مسٹر آر۔ اے۔ بٹلر کے حالیہ ایجوکیشنل ایکٹ میں تمام بچوں کو بجائے ۱۴ کے ۱۵ یا ۱۶ برس کی عمر تک تعلیم دلانے اور فی جماعت طلباء کی تعداد ۴۰ تک محدود کر دینے

سے متعلق بحث کی گئی ہے۔ اس کے لیئے ینگ پیلپس کالجز (Young peoples Colleges) کے قیام پر بھی غور کیا جا رہا ہے۔ لیکن واحد علاج یہی ہو سکتا ہے کہ مدرسین کی تنخواہیں دوچند کر دی جائیں اور ان کی تعلیم کا انتظام اس طرح کیا جائے کہ تمام کے تمام کسی جامعہ یا سیوک کالج ( Civic ) میں کم از کم تین سال پڑھ کر ڈگریاں حاصل کریں۔ تعلیم کے موجودہ دو راستے برخاست کر کے سبھوں کے لیئے صرف ایک راستہ کھولا جائے۔ بچہ نرسری اسکول میں چار یا پانچ سال کی عمر میں داخل ہو سات سال کی عمر میں پرائمری مدرسہ میں شریک کیا جائے۔ پھر گیارہ برس کا ہوا تو ثانوی مدرسہ میں سولہ برس کی عمر میں ایک امتحان اسکول ریکارڈ کے معائنہ اور رپورٹ کے ساتھ ہو۔ نتیجہ خاطر خواہ ہوتے پر اٹھارہ یا انیس سال کی عمر تک اس کو (ا) کسی پبلک اسکول میں منتقل کیا جائے یا (ب) ینگ پیلپس کالج میں خواہ ہمہ وقتی طالب علم کی حیثیت سے یا جز وقتی۔ صورت (ا) میں اسکو کسی جامعہ میں ۲۲ سال کی عمر تک ڈگری کیلئے پڑھایا جائے۔ صورت (ب) میں ۱۹ برس کی عمر کے بعد ہی بالکلیہ دائرہ ملازمت میں داخل کیا جائے۔ اگر والدین کی مالی حالت ایسی سقیم ہو کہ بچہ کو ۱۶ برس کی عمر تک ہی پڑھا سکتے ہیں تو اس کو جز وقتی ملازمت کے ساتھ مزید تعلیم کا موقعہ دیا جائے۔ تعلیم کی حد پڑھنے والے کی ذہنی قابلیت پر موقوف ہونی چاہیئے۔ معاشی و معاشری امتیازات بالکلیہ برخاست کر دیئے جائیں۔ سبھوں کی فیس تعلیمی و اخراجات رہائش حکومت ادا کرے بلکہ اگر ضرورت ہو تو والدین یا سرپرستوں کو بچوں کے لباس وغیرہ کی تیاری یا موسمی تعطیلات کے زمانہ میں بچہ گھر پر رہنے کے اخراجات کے لیئے بھی کچھ امداد دی جائے۔

ٹیچرس کالجوں کے عوض سیوک ( Civic ) کالج قائم کیئے جائیں۔ جہاں لندن اسکول آف ایکونامکس کے طرز پر مختلف ملکی و معاشی فنون کسب روزگار کی تعلیم کا انتظام مہیا ہو۔ یہ کالج موجودہ جامعات کے مسلّمہ ہونے چاہئیں۔ ان میں برسر خدمت مدرسین کو دس برس میں چھ مہینوں کے لیئے اور بیس برس میں ایک برس کے لیئے ریفریشر (تجدید آموختہ) کورس سے استفادہ کا موقعہ دیا جائے۔

# جامعی تعلیم

متعدد نقادوں نے آکسفرڈ اور کیمبرج کی جامعات کو ان کے صدیوں کی تعلیمی روایات اور رہائشی طریقہ تعلیم کی برکات کی بنا پر دیگر غیر رہائشی جامعات عالم پر فوقیت دی ہے۔ یہاں تعلیم رہائشی زندگی کا جز و بن جاتی ہے اور علم غیر محسوس طریقہ پر گویا خود بخود طالب علم کے اندر جبری محنت و مشقت بغیر سرایت کر جاتا ہے اگرچہ عامہ طلباء کی رسائی علم کے انتہائی مدارج تک نہیں ہو سکتی (حالانکہ اسکے بھی کافی موقعے موجود ہیں) تاہم جو کچھ سیکھا جاتا ہے جز و ذہن بن کر رہتا ہے۔ اکثر نوجوان جو وہاں جاتے ہیں وہاں کی خوشگوار زندگی ( [illegible] ) ہی کی خاطر جاتے ہیں۔ ایک معین تعداد دیگر جامعات کے فارغ التحصیل اشخاص کی بھی وہاں کے مشاہیر کے ساتھ مل کر کام سیکھنے اور نئی تحقیقات کرنے کے لیئے جاتی ہے مثلاً لارڈ رور فرڈ آنجہانی کے فیض اثر سے تمام دنیا کے سائنس دانوں نے فائدہ اٹھایا اور طبیعات و کیمیا ایک ہو کر جوہری توانائی کے استعمال کے راستے کھولے گئے۔ ایسی ہستیاں دنیا کی دوسری جامعات میں بھی پیدا ہوتی ہیں مگر کیمبرج ہو کہ آکسفرڈ یا لندن ہو کہ پیرس ییل ہو کہ ہارورڈ۔ یہاں بھی ایسے مشاہیر کا وجود نادرات ہی سے سمجھنا چاہیئے۔ بدبخت آدمی کی کوئی کیا مدد کر سکتا ہے۔ بمصداق شعر ؎

تہی دستان قسمت را چہ سود از رہبر کامل　　　کہ خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را

ایک معتدبہ جماعت ایسے نوجوان کی بھی ان جامعات میں داخل ہو جاتی ہے جو تحصیل علم کے لحاظ سے جیسے گئے تھے ویسے ہی واپس آتے ہیں البتہ طرز گفتگو طریقہ نشست و برخاست و عام دنیاوی معلومات کی حد تک ان کو بھی نمایاں ترقی حاصل ہو جاتی ہے۔

نئی اور علی الخصوص اضلاع کی نئی جامعات میں (جن کے لئے لال اینٹ والی یونیورسٹی نام ایجاد کیا گیا ہے) درسگاہیں عموماً وسط شہر میں واقع ہوتی ہیں۔ طلباء کا رہنا بسنا وہاں سے میلوں دور ہوتا ہے۔ کھانے کے ہال ایک محلہ میں تو کتب خانہ دوسرے محلہ میں۔ دارالمباحثہ انجمن طلباء یا بازی گاہ جانے کے لئے موٹر بس یا ٹرام کار میں معتدبہ وقت رائیگاں کرنا پڑتا ہے۔ [اس لئے اکثر طالب علم وہاں جاتے ہی نہیں۔ جو جاتے ہیں اس کام کو بڑی چیز سمجھ کر اس پر فخر کرتے ہیں]۔ طلباء باہم دگر بے تکلفی سے مل نہیں سکتے۔ اوقات درس کے باہر اساتذہ سے ملاقات اور تبادلہ خیال ایک نعمت غیر مترقبہ ہی تصور ہو سکتی ہے جو صرف خاص قابلیت یا شخصیت کے طلباء کو نصیب ہوتی ہے۔

ان دقتوں کی وجہ سے رائے عامہ ہے کہ "لال اینٹ والی جامعات" کے تعلیم یافتہ عموماً صرف اپنے خاص اسپیشیلائزیشن کے مضمون کے ماہر ہوتے ہیں اگر بالطبع یا جامعہ سے غیر متعلق بیرونی اثرات کے تحت وزندگی کے ضروری پہلوؤں سے وہ واقف ہوئے ہوں تو قیادت یا انتظامی کاروبار کی اُن سے توقع مشکل ہے ان کا یہ نقص، دراصل ان کے طریقہ تعلیم کا نقص ہے جس کی وجہ سے بیک وقت دل و دماغ اور دست و بازو کی مکمل تربیت نہیں ہونے پاتی۔ بریں ہم ان دقتوں اور مجبوریوں کے باوجود یہ جامعات اپنا خود اختیاری فرض سمجھ کر ان نقائص کو رفع کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اگرچہ ان کے بانیان اسکی ضرورت نہیں سمجھتے کیوں کہ صنعتی تہذیب تعلیم کو آمدنی وخرچ کے توازن کے نقطۂ نظر سے دیکھتی ہے۔ سائنس کی تعلیم نے تو اس نقطۂ نظر کو اور بھی واضح کر دیا۔

جو ڈلے نے تجویز پیش کی ہے کہ تمام بچے جو اپنی دماغی قابلیت کے بنا پر پبلک اسکول کی تربیت کے اہل ہوں وہاں وہ بلا لحاظ مالی و معاشرتی امتیاز شریک کر دئے جائیں ان کی فیس (Community) ملت کے روپیہ سے ادا ہو اور ملت ہی ان مدارس کی نگرانی کرے دوسرے مدارس کے ساتھ ان کا کیا تعلق ہونا

چاہیئے۔ اور ان کے اساتذہ کیسے ہوں ان کا ذکر قبل ازیں اجمالی طور پر آگیا ہے رہا ان کے طلباء کا انتخاب، بٹلر ایجوکیشن ایکٹ کی رو سے توقع کی جاتی ہے کہ (ا) ایک غیر معینہ مدت میں بچوں کو سولہ برس کی عمر تک مدرسوں میں زیر تعلیم رکھا جائے گا (ب) ملازمت پیشہ بچوں کو ینگ پیپلس کالجز میں سولہ سے اٹھارہ برس کی عمر تک جز وقتی غیر فنی تعلیم ہفتہ میں کم از کم ڈیڑھ گھنٹہ سے ڈہائی گھنٹوں تک دوران اوقات ملازمت دلائی جائے گی لیکن چونکہ گرامر اور پبلک اسکولوں کے علاوہ (جہاں فیس کی ادائی لازمی ہے) اس ملک میں اپنے بچوں کے لیئے جو سولہ سال کی عمر میں مدرسہ چھوڑ دیتے ہیں کوئی ہمہ وقتی (Full-time) تعلیم کا انتظام نہیں ہے، جوڈ کا مشورہ ہے کہ تمام وہ بچے جو سولہ برس کی عمر میں ثانوی مدارس سے نکلتے ہیں اور اپنی دماغی قابلیت کی بناء پر پبلک مدارس میں شرکت کے موزوں ہیں، پبلک اسکولوں میں داخل کیئے جائیں۔ لیکن صرف دو یا تین ہی سال کے لیئے حالیہ عملدرآمد یہ ہے کہ تیرہ یا چودہ برس کی عمر کے لڑکے چار یا پانچ سال کے لیئے وہاں شریک رہتے ہیں۔ اگر اس کے عوض سولہ سے اٹھارہ برس کی عمر تک ہی وہاں انھیں تعلیم دلائی جائے اور صحیح طریقہ پر انکا انتخاب عمل میں آئے تو موجودہ پبلک مدارس میں پچاس ساٹھ ہزار بچوں کی تربیت ہوسکیگی۔ آر۔ ایچ۔ ٹانی (Tauney) وغیرہ نے بھی اس مشورہ کی تائید کی ہے۔ بقیہ بچوں کو ینگ پیپلس کالجز میں داخل کیا جاسکتا ہے۔ آکسفرڈ اور کیمبرج کی طرز کے قدیم روایاتی کالج بنانے کے متعلق انکی تجویز ہے کہ ایٹن (Eton) اور ونچسٹر (Winchester) کے پبلک مدرسوں کو جہاں کا طریقہ تعلیم متذکرہ بالا جامعات ہی کے طرز کا ہے اور جو قدامت میں ان جامعات پر بھی سبقت لے جاتے ہیں جامعات میں تبدیل کر دیا جائے۔ اس طرح موزوں طلباء کی تربیت کے لیئے بجائے دو جامعات کے ایسے چار ایک ہی طرز کی جامعات قائم ہوجائیں گی۔

# تعلیم بالغان

دنیا کے سینکڑوں ایسے معاملات ہیں جن کے فی الواقع سمجھنے کے لیئے انسان کو کافی آزمودہ کار ہونے کی ضرورت ہے محض کتابیں پڑھنے، لکچر سننے یا مطالعہ کرنے سے یہ معاملات مکمل طور پر ذہن نشین نہیں ہو سکتے اس کے لیئے انسان کو خود اپنا ذاتی تجربہ حاصل کرنا لازمی ہے۔ پورا تجربہ ایک عمر کو پہنچے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ سر رچرڈ لیونگسٹن ( Livingston ) نے اپنی تصنیف موسومہ مستقبل تعلیم ( The Future of Education ) میں ارسطو کے اس ارشاد کی طرف توجہ دلائی ہے کہ "تاریخ" و فلسفہ، سیاسیات اور ادب کے اکثر اہم رموز سے انسان صرف اسی وقت اچھی طرح واقف ہو سکتا ہے جب کہ اسکو ان کا ذاتی تجربہ ہو۔ کسی ایک فن کا ماہر اسی ایک فن کی نسبت صحیح رائے قائم کر سکتا ہے۔ اس کے باہر نہیں۔ وسیع معلومات عامہ ہی کا آدمی امور عامہ کے متعلق صائب رائے دے سکتا ہے۔ اس لیئے ناتجربہ کار نوجوان خواہ وہ کتنا ہی تعلیم یافتہ ہو سیاست مدن کے عملی مسائل اور زندگی کے اہم امور وغیرہ پر دسترس حاصل کرنے میں قاصر ثابت ہوتا ہے۔ لیکن ناقص تعلیم یافتہ پختہ عمر کے آدمی کا تجربہ ہی اسکو اپنے مفوضہ خدمات صحیح طور پر بجا لانے کا اہل بنانے کے لیئے کافی نہیں۔ اسکو عالم بھی بننا چاہیئے۔ اسی لیئے ملک کے حقیقی نظم و نسق کے لیئے تعلیم بالغان کا خاطر خواہ انتظام ناگزیر ہے۔

مسٹر بٹلر کے ایجوکیشن ایکٹ سے پہلے شائع کردہ کاغذ ابیض ( White paper ) میں ان امور کی اہمیت بخوبی تسلیم کی گئی ہے۔ اور عمومی شہریت ( Democratic Citizenship ) کی تربیت کے لیئے تعلیم بالغان پر

اصرار کیا گیا ہے۔ لیکن اسپارہ میں ایکٹ محولہ کے پیش کردہ تجاویز برطانوی مبصرین کی رائے میں ناکافی تصور کئے جاتے ہیں۔ پہلے تو ان کے اجرا کے لئے ایک مدت مدید درکار ہوگی دوسرے جو رقمی امداد تعلیمی عمارات کے لئے مقرر کی جا رہی ہے ناکافی سمجھی گئی ہے۔ ہم ان کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتے اتنا کہدینا مناسب سمجھتے ہیں کہ سن رسیدہ عوام الناس پر تعلیم و تربیت کا پورا اثر صرف اس وقت محسوس ہو سکتا ہے جبکہ اوقات تعلیم موزوں اور ماحول خوشگوار و ہمت افزا ہوں۔ (یہاں تعلیم کے شیدائیوں سے بحث نہیں وہ کہیں اور کیسے بھی اپنا مقصد حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن ہر شخص علم کا شیدائی نہیں ہوتا) بدیں وجہ اچھے قصباتی کالجوں خصوصاً امپنگٹن ( Impington ) کالج کی طرز کی تعلیم گاہوں کے قیام پر زور دیا جا رہا ہے۔ جہاں ملازم پیشہ اپنے کام ختم کر کے اطمینان قلب کے ساتھ بیٹھ کر تعلیم حاصل کر سکیں۔ اس لئے ملت و حکومت کے پیسے سے ہر شہر میں پبلک لکچر ہال کتب خانے دار المطالعے اور دار المباحثے وغیرہ جلد سے جلد تعمیر کرائے جانے چاہئیں۔ صنعتی کارخانوں کے سرمایہ داروں اور خود غرض قائدوں کو عوام الناس کی حقیقی تعلیم سے ہمیشہ چھپی مخالفت رہی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ عوام الناس کی جہالت برقرار رہے تاکہ ان کی کورانہ اطاعت سے فائدہ اٹھاتے رہیں۔ انھیں خوف لگا رہتا ہے کہ تعلیم پانے کے بعد عوام الناس ان کا آسان شکار نہ بن سکیں گے۔ اس غلط تصور کا قوم و ملت پر جو بُرا اثر پڑتا ہے محتاج تشریح نہیں۔ زمانہ دراز سے سیاسی دنیا میں "کامیاب زندگی" بسر کرنے کے لئے ناگزیر سمجھا جا رہا ہے کہ ذی اثر طبقہ یا جماعت کی بے سمجھے بوجھے تائید کی جائے یا خود غرض قائدین کی کورانہ فرماں برداری کی جائے۔ اسکی وجہ سے دنیا مصائب و آلام اور جنگ و جدل کی بھول بھلیاں میں چکر لگاتی جا رہی ہے اور ان سے باہر نکل نہیں سکتی۔ اس کا واحد علاج عوام الناس کی صحیح تعلیم و تربیت علی الخصوص احکام الہی کی پُرخلوص تعمیل ہے۔

اصلاح و توسیع تعلیم کے ضمن میں جو اہم مشورے جوڈ نے پیش کئے ہیں ان میں چند حسب ذیل ہیں :-

معاشرتی مراکز (سوشیل سنٹرز) قصباتی کالج کمیونٹی ہال وغیرہ جیسا کہ ناٹنگھم (Nottingham) میں ہیں تیار کرائے جائیں۔ لندن کے ایسٹ اینڈ (مشرقی حصہ) میں ٹوئنبی ہال (Toynbee Hall) کی قسم کے ہال بنائے جائیں۔ غیر اقامتی مراکز، میری وارڈ سٹلمنٹ (Mary Ward Settlement) سٹی لٹریری انسٹیٹوٹ، مور لے (Morley) کالج کے مماثل قائم ہوں۔ ورکرز ایجوکیشنل ایسوسیشن (W.E.A) کی طرح ملت ان کاموں میں حکومت کا ہاتھ بٹائے۔ اس طریقہ عمل کی درخشاں مثال ڈنمارک اور سویڈن کی ہائی اسکول تحریک ہے جس میں نوجوان ملازمین کو ان کے آقاؤں اور ٹریڈ یونین کے اشتراک عمل سے اوقات ملازمت میں غیر فنی لیبرل (Liberal) تعلیم دی جاتی ہے اور اس سے ان کے مکھن وغیرہ کی صنعتوں کو نمایاں ترقی ہو رہی ہے۔

مذہبی تعلیم مختلف مکتبوں سے مخصوص نہ کی جائے بلکہ حکومت کی جانب سے طلباء کے مبینہ عام عقائد کے بموجب حکومت ہی کے مامور کردہ موزوں معلموں کے تفویض کی جائے۔ [اس ضمن میں بیان کیا گیا ہے کہ جدید آبزرویشن سروے کے لحاظ سے برطانیہ کے موجودہ باشندوں میں صرف دس فیصد اپنا تعلق کسی چرچ سے بتاتے ہیں اور فقط تیس فیصد عیسائی مذہب کی تلقین پر اپنا اعتقاد ظاہر کرتے ہیں۔ البتہ رومن کیتھولک فرقہ کے لوگ اپنے مذہبی عقائد میں مستحکم نظر آتے ہیں۔]

ترقی تعلیم بالغاں کی نسبت کا غذ ابیض میں بتایا گیا ہے کہ جنگ کے ختم ہونے کے ساڑھے پانچ سال تک دیگر مصروفیتوں کی وجہ سے اس جانب برطانیہ میں کچھ تغیر نہ ہو سکیگا۔ اس کے بعد مسلمہ اداروں کو اس غرض کے لیئے منجانب حکومت جو رقم (نو دہزار دوسو پونڈ سالانہ) دی جاتی تھی اسمیں بشمول اغراض فنی (ٹکنیکل) تعلیم اضافہ کرنے کے

پہلے سال ۲۲ لاکھ پونڈ کر دی جائے پھر ہر سال مزید اضافہ ہو کر بالآخر ۷۰ لاکھ پونڈ تک پہنچا دی جائے۔ بورڈ آف ایجوکیشن کے پارلمنٹری سکریٹری کا کہنا تھا کہ تعلیم بالغاں کے لئے جدید امکنہ کی ضرورت نہ ہوگی۔ جوڈ نے حقیقت حال اس سے مختلف بتائی ہے اس کا بیان ہے کہ جن مکانات میں تعلیم بالغاں کا انتظام کیا گیا ہے وہ یا تو چھوٹے بچوں کی تعلیمی جماعتوں کے کمرے ہیں یا عارضی یا جزوقتی، حکومت یا دیگر اداروں سے مستعار لیئے ہوئے کمرے یا ہال ہیں مثلاً سینما گھر، چرچ وغیرہ سے۔ ان رکاوٹوں کے باوجود بھی مزدور پیشہ لوگ کام سے تھکے ماندے تنگ و نسبتہً تاریک کمروں اور ناخوشگوار ماحول میں تعلیم حاصل کرنے کا شوق رکھتے اور اس کا عملی ثبوت دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ دوران جنگ ۱۹۴۳ء میں بالغوں کی سب سے بڑی تعداد جو ۲۷ ہزار انفاس تھی نوشت و خواندگی باضابطہ تعلیم پائی امن کے زمانے میں یہ تعداد کبھی ساٹھ ہزار سے متجاوز نہ ہو سکی۔

ڈاکٹر اسپنسر ( Spencer ) کا اندازہ ہے کہ برطانیہ کے موجودہ مدارس کی عمارتوں کو نئے طرز پر لانے جمینیزیم (ورزش گاہ) تیرنے کے حوض موزوں و مناسب کھانے کے کمرے اسمبلی ہال ورکشاپ وغیرہ کے ساتھ اس تعداد میں کلاس روم تیار کرانے کیلئے کہ کسی میں بوقت واحد میں سے زیادہ طالب علم نہ پڑھائے جائیں۔ معہ ان کے ماحول کو پرفضا بنانے کے اخراجات کے ایک سو ملین پونڈ کافی ہو جائیں گے۔ اس رقم کو پانچ سال پر پھیلایا جا سکتا ہے۔ رقم بظاہر بہت کثیر نظر آتی ہے۔ لیکن برطانیہ کے لیئے بڑی نہیں ہے۔ جہاں امن کے زمانے میں موٹروں کو تیز سے تیز تر چلانے کیلئے سڑکوں پر سالانہ بیس ملین پونڈ خرچ کئے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آغاز جنگ سے مئی ۱۹۴۱ء تک موٹروں کی اس تیز رفتاری سے ۵ لاکھ ۸۸ ہزار انسان مرے یا مجروح ہوئے حالانکہ اسی مدت میں دشمن کے حربوں سے اموات و مجروحین کی تعداد ۳ لاکھ ۰۷ ہزار اشخاص ہوئی۔

# مختلف ممالک کی جامعات کے تعلیمی نظاموں کا باہمہ دیگر مقابلہ

اس موضوع پر ہم انجمن پروفیسران و لکچراران ممالک اتحادی مقیم برطانیہ کی رپورٹ متعلقہ دوم تعلیمی کانفرنس منعقدہ ۱۵ اپریل ۱۹۴۴ء بمقام رائل انسٹیٹیوشن لندن کا خلاصہ روئداد مرتبہ آر۔ ڈگلس لاری ( R. Duglas Lawrie ) [جس کا پیش لفظ سر ارنسٹ بارکر ( Sir Ernest Barker ) صدر منتخبہ نے لکھا تھا] قارئین کے مطالعہ کے لئے پیش کرتے ہیں :-

افتتاحی تقریر پروفیسر جے ٹمرمینس ( Jean Timmermans ) جامعہ بلجیم صدر انجمن کی تھی۔ ۱۹ مقررین نے اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر کسی غیر ملک کی جامعات پر تقریریں کیں ان تقریروں کے چار عنوان تھے : (ا) جامعات کے تحقیقاتی کام (ب) جامعات میں طریقہ تدریس ( ج ) جامعہ کا اثر تعلیم پر ( د ) جامعات کا اثر سوسائٹی (سماج) پر۔

(۱) پروفیسر ٹمرمینس نے بتایا کہ قبل جنگ برطانوی جامعات کے ساتھ کسی قسم کا تعلق یا تماس قائم کرنا بہت مشکل تھا۔ ہر یونیورسٹی کے لئے علیحدہ تحریک اور سعی کی ضرورت تھی اس لئے برطانوی جامعات کی کونسل کے انعقاد کی تحریک ایک مبارک اقدام ہے۔

(۲) پروفیسر جی۔ آئی۔ فنچ ( G. I. Fench ) برطانیہ عظمیٰ نے جامعہ برسلز ( Brussels ) میں اپنے زمانہ قیام کا ذکر کیا جب کہ بہ حیثیت ویزیٹنگ پروفیسر انھوں نے وہاں ۱۹۳۷ء تا ۱۹۳۸ء ایک مشن تک کام کیا جس سے طرفین کو فائدہ حاصل ہوا ان کی تحریک تھی کہ ہر جامعہ میں ایسے ویزیٹنگ پروفیسر کی خدمت قائم ہونی چاہیئے۔

(۳) کئی مقرروں نے جامعہ اور باشندگان ملک کے باہمی تعلق پر بحث کی۔ سر ارنسٹ سائمن ( Sir Ernest Simon ) برطانیہ نے جو حال ہی میں ممالک متحدہ امریکہ سے واپس ہوئے تھے برطانوی سررشتہ صنعت و حرفت پر سخت نکتہ چینی کی کہ وہاں سائنٹیفک تحقیقات پر

نسبتہً بہت کم توجہ کی جاتی ہے ۔ ملک میں جو بھی تحقیق ہوتی ہے اس کے نتائج سے استفادہ نہیں کیا جاتا۔ اس کے برخلاف امریکہ میں صنعت سے متعلق تحقیقاتی کام بڑے شوق سے کئے جاتے ہیں اور تعلیم یافتہ نوجوان اٹھارہ سال کی عمر کے بعد مزید چار سال تک اپنے آپ کو ان کاموں میں مصروف رکھتے ہیں ۔ سربرآوردہ پسندوں اور کارخانوں کے ڈائرکٹر (منتظم) خود عموماً جامعات کے طیلسانی ہوتے ہیں ۔ (لنکاشائر کی روئی کی صنعت میں اہم خدمات پر جامعہ کا تعلیم یافتہ بمشکل ہی نظر آئے گا۔ اس لئے کاٹن ریسرچ ایسوسیشن کے اعلیٰ تحقیقاتی کاموں کے نتائج سے کارخانہ جات بقدر ایک فیصد بھی کسی طرح استفادہ کرنے کے قابل نہیں ہیں ۔)

مسٹر ولیرڈ کونیلی Willard Connely ممالک متحدہ (امریکہ) نے بتایا کہ دوسرے اور بہتر طریقوں سے بھی امریکہ میں جامعہ کا سوسائیٹی پر کیا اثر ہے ۔

ڈاکٹر ایم روہیمان M.Ruhemann برطانیہ میں فرنیکلیلس منیر محدود کے ریسرچ فزسیسٹ اور مسز بیٹرس کنگ Mrs.Beatrice King برطانیہ نے اول الذکر دو مقرروں نے ممالک متحدہ امریکہ سے متعلق جامعہ کا جو اثر بیان کیا تھا اس کے مقابل سوویٹ روس (U.S.S.R) میں جامعاتی اثرات کی تفصیل ظاہر کی ۔ ڈاکٹر روہیمان نے سمجھایا کہ سوویٹ روس سائنٹفک ریسرچ کو اس لئے اہمیت دیرہا ہے کہ اس کا مقصد ہے کہ ریسرچ کے ذریعہ عطیات فطرت میں ترقی دیکر ملک کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچایا جائے مسز کنگ نے کہا کہ روس کے لوگ اب بخوبی واقف ہوگئے ہیں کہ ان کی آسائش تندرستی اور مسرت کا جامعہ سے براہ راست تعلق ہے ۔ جامعہ نہ صرف حکومت صنعت (ادبی، تاریخی اور سائنسی) تحقیقات کی تعلیم دیتی ہے بلکہ زندگی کے ہر شعبہ

کے لئے طالب علم کے مذاق اور پیشہ کے لحاظ سے تربیت کا انتظام کرتی ہے یہ عمل برطانیہ کے لئے باعث حیرت ہے لیکن روس اور امریکہ جیسے باہم دیگر بنیادی اختلافات رکھنے والے ممالک میں کامیاب طریقہ پر جاری ہے

(۴) پروفیسر سومرفلٹ A. Sommerfelt ناروے نے بیان کیا کہ ناروے اور فرانس میں سوسائٹی پر جامعہ کے کیا اثرات ہیں۔ اور کہا کہ دونوں ملکوں میں جامعات آزادی کی تحریک کے علمبردار ہیں۔ ناروے اور سویڈن کی جامعات میں سیاسی یا طبقاتی اغراض سے متاثر ہونے کا امکان بہ نسبت اکثر دوسری آزاد جامعات کے کم نظر آتا ہے۔

(۵) پروفیسر ڈبلیو۔ جے۔ روز W. J. Rose کناڈا حال برطانیہ نے جنہیں پولینڈ کی جامعات سے براہ راست بہت گہری واقفیت حاصل ہے، اُس ملک کی سائنس کی تعلیم اور تدریس پر روشنی ڈالی۔ وہاں بھی ہمیشہ یہ مسئلہ زیر غور رہا ہے کہ آیا تعلیم کا مقصد انسان کی پوری ذہنی اور طبعی قوت کو فروغ دینا ہے یا صرف روزگار کمانے کے قابل بنانا۔ اسی طرح بتایا گیا ہے کہ ریسرچ اور تدریس کے توازن میں بھی وقتاً فوقتاً مناسب تغیر تبدل ہوتا رہا ہے

(۶) پروفیسر ای۔ ورمیل ( E. Vermeil ) فرانس نے جرمنی اور مغربی ڈیموکریسیوں (عمومی حکومتوں) کی جامعی اسپرٹ یا ذہنیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جرمنی میں ۱۸۷۱ء سے جامعہ کے آزادی پسند روایات روز بروز گھٹ کر قومیت میں تبدیل ہو گئے۔ اور اس طرح دونوں عالمی جنگوں کے درمیان علم کا دائرہ اپنی عالمگیر وسعت کو چھوڑ کر خالص جرمن مفاد پر مرکز ہو گیا۔

ہٹلر ( Hitler ) کے تسلط کے بعد جرمنی بالکلیہ ہٹلرزم کا شکار بن گیا۔ خوش قسمتی سے مغربی عمومی حکومتیں ایسے قبیح تنگ خیال رحجانات سے محفوظ رہیں۔ لیکن ان میں بھی اسپیشیلائزیشن (خاص خاص مضامین کی ترقی) علم کا

میکانیت اور حکومت کی طرف سے بیجا مداخلت کا خطرہ لگا ہوا ہے

(۷) سر فریڈ کلارک (Sir Fred Clarke) برطانیہ نے جامعہ اور معلّمی کے پیشہ پر تقریر کرتے ہوئے اس امر کی طرف قوت کے ساتھ توجہ مبذول کرائی کہ کوئی جامعہ کسی پیشہ کے لئے طلبار کو مکمل تربیت دینے کے قابل سمجھی جاسکتی ہے تاوقتیکہ اس کی چار دیواری میں پیشہ متعلقہ کی باضابطہ تعلیم کا انتظام نہ کیا جائے۔ طب اور انجینیرنگ کی حد تک یہ شرط معقول طور پر پوری متصور ہوسکتی ہے لیکن خود معلّمی کے پیشہ کے لئے اس جانب ابھی خاطر خواہ کوشش نہیں شروع ہوئی۔

(۸) مقررین کی ایک جماعت نے جامعہ کے اساتذہ اور طلبار کے باہمی ارتباط پر بحث کی۔ مسٹر بروس ٹرسکاٹ (Bruce Truscot) "لال اینٹ کی جامعہ" کے حقیقی مگر فرضی نام کے مصنف نے ایک مقالہ پڑھا جس میں انہوں نے اپنا خوف ظاہر کیا کہ جامعہ کے معلم و متعلم کے مابین فصل بڑھتا جارہا ہے جس کی اصلاح کیلئے جامعہ اور مدرسہ یا مکتب کے باہمی تعلقات میں اضافہ کی ضرورت ہے۔ انکی تحریک ہے کہ مدرسہ کے نوجوان مدرس کو جامعہ کا لکچرار بننے کا موقعہ دیا جائے اور جامعہ کی کہنہ خدمت کے لکچرار کو ثانوی مدرسہ میں ترقی کے ساتھ مامور کیا جائے۔

پروفیسر پی واوچر (P Vaucher) نے بحیثیت ایک فرانسیسی کے برطانوی جامعات کے طریقۂ تدریس کا ذکر کرتے ہوئے فرانسیسی جامعات کے عام طریقۂ عمل پر زور دیا کہ جامعہ کے مدرس سے توقع کی جائے کہ وہ ثانوی مدرسہ میں چند سال درس دیکر آئے۔ مسٹر گرٹسباوسکی (S.Grzybowski) جامعہ ایڈنبرا کے پولستانی مدرسہ طب کے متعلم نے بیان کیا کہ جامعہ مذکور میں پروفیسر و طالب علم کے تعلقات بہت قریبی ہیں اور اس سے معلم و متعلم دونوں

کو فائدہ پہنچتا ہے۔

(۹) پروفیسر واؤچر نے جامعات میں طلبار کے علمی کام کی نگرانی سے متعلق بیان دیا کہ برّاعظم یورپ کے عالم کو سب سے زیادہ یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ قدیم تر جامعات میں ٹیوٹوریل (تدریسی) طریقہ مروج ہے اور جدید تر جامعات میں سوپروائزر (نگرانی) کا طریقہ ۔ مسٹر گرٹسباوسکی کا خیال ہے کہ برطانوی جامعہ اپنے آپ پر کافی بھاری نگرانی کا بار عائد کرلیتی ہے تاکہ طالب علم اپنا مفوضہ کام بخوبی انجام دے ۔ ان کی رائے میں یہ طریقہ اوسط قابلیت کے طالب علم کے لئے اچھا ہے مگر بہتر قابلیت کے طلبار کے لئے برّاعظم کی جامعات کا طریقہ زیادہ سودمند ثابت ہوتا ہے ۔

(۱۰) جامعات میں ریسرچ اور تدریس کی اضافی حالت سے متعلق مسٹر گرٹسباوسکی کی رائے میں یہ تصور کہ جامعہ کو چاہئے کہ تدریس کو ریسرچ کی نسبت زیادہ اہمیت دے ، برطانیہ کے اندر زیادہ مروج ہے بہ نسبت کسی دوسرے ملک کے ۔ برّاعظم کی بعض جامعات سے برطانیہ میں بہت زیادہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ جامعہ کا پہلا اور سب سے بڑا فرض درس تدریس ہے ۔

(۱۱) مس ۔ ایم ۔ آر ۔ گیل (Miss. M.R. Gaze) معتمد بین الاقوامی سونسل طلبار برطانیہ عظمیٰ و نیشنل یونین طلبار نے اس نازک مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے کہ جامعی زندگی سے طالب علم کو آگے چل کر اچھا شہری بننے میں کیا مدد مل سکتی ہے ۔ علیحدہ اس سے کہ وہ کسی پیشہ کی تعلیم پائے یا خالص تعلیم کی تربیت پائے کہا کہ طلبار کی انجمن اتحاد اس مقصد کے سب سے اہم واحد اداروں میں شمار ہوتی ہے ۔ اس میں طلبار کی کثیر جماعت کمیٹیوں، پبلک تقریر، انتظامی کاروبار وغیرہ کے لئے تربیت پاسکتی ہے جو آگے چلکر انہیں اچھے شہری کی زندگی بسر کرنا سکھاتی ہے ۔ انجمن اتحاد اپنے متعدد مشغلوں کے ذریعہ ہر مفید

مضمون پر تقاریر، مباحثے وغیرہ مہیا کرسکتی ہے۔ طالب علم کو چاہیے کہ وہ یہاں اپنے ابتدائی ذاتی خیالات دوسروں کے خیالات کے پہلو بہ پہلو پیش کرے اور اپنے ذاتی تجربہ یا اپنے دوستوں کی توضیح کی روشنی میں دوسروں کے خیالات کی، اگر ضرورت ہو، تبدیلی کے طریقے معلوم کرے۔

(۱۲) مسٹر گرشیاوسکی کو یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ برطانیہ کے طالب علموں کی زندگی اور بقیہ باشندگان ملک کی زندگی میں ایک بڑا خلیج حائل ہے۔ ان کے خیال میں اس کی وجہ ایک حد تک برطانوی طلباء کے سیاسی ذوق کی کمی ہے۔

(۱۳) مس میفینوی وڈ (Myfanwy Wood) نے پیکنگ Peking کی ینچنگ (Yenching) جامعہ کی طرف سے تقریر کرتے ہوئے بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا کہ برطانوی طالب علم کی پرسکون زندگی کے مقابل چینی طالب علم کو اپنی کتابیں لئے ہوئے پندرہ سو میل کا راستہ طے کرنا پڑا تاکہ نئے جامعی مرکز میں داخل ہوکر تعلیم حاصل کرسکے۔

(۱۴) مسٹر جے۔ ایل۔ ہنڈرسن (J.L. Henderson) جنرل سکریٹری برٹش کمیٹی ورلڈ اسٹوڈنٹ ریلیف (World Student Relief) نے گزشتہ عالمی جنگ میں ریلیف کا جو کام ہوا اسکی تصریح کی۔

اس کے بعد کھلے بحث مباحثے ہوکر صدر جلسہ نے تقریر کی اور شکریہ کے ووٹ (Vote) کے بعد جلسہ برخواست ہوا۔

# ممالک متحدہ امریکہ میں جامعاتی تعلیم اور ریسرچ سے متعلق انتظام

۱۹۳۷ء - ۱۹۳۸ء میں ممالک متحدہ امریکہ کے جامعاتی طلبار کی تعداد دس لاکھ تھی - اور ہمہ وقتی اساتذہ کی تعداد ایک لاکھ - اس کے برعکس برطانیہ عظمیٰ میں صرف پچاس ہزار طلبار تھے - یعنے امریکہ کی آبادی کے لئے جو برطانیہ کی سہ چند تھی اساتذہ کی تعداد برطانوی طلبار کی تعداد کے دو چند تھی - ذیل کی جدول میں دونوں ملکوں کے اس سال کی جامعات کی آمدنی اور خرچ کی تفصیل درج ہے -

| | برطانیہ عظمیٰ | ممالک متحدہ امریکہ |
|---|---|---|
| فیس | ۲ ملین پونڈ | ۳۴ ملین پونڈ |
| حکومت کے تمام ذرائع سے عطیات | ۳ | ۳۲ |
| اوقاف اور دیگر عطیات وغیرہ | ۱٫۵ | ۳۱ |
| جملہ میزان | ۶٫۵ ملین پونڈ | ۹۷ ملین پونڈ |

سہ چند آبادی کا لحاظ کرتے ہوئے فی ہزار متنفس کی تعلیم پر امریکہ میں روپیہ برطانیہ کی بہ نسبت پانچ گنا صرف ہوا -

کیلیفورنیا کے اسٹیٹ کی آبادی سات ملین ہے لیکن اس ایک اسٹیٹ میں جامعاتی تعلیم پر پورے برطانیہ سے زیادہ روپیہ خرچ کیا جاتا ہے - بیشتر امریکی جامعات کے میدانوں کا رقبہ ایک سو سے لیکر دو سو ایکر ہے - جامعات ہارورڈ ییل ( Yale ) اور پرنسٹن کی عمارت کی خوبصورتی سے تمام یورپ واقف

کیلیفورنیا کی جامعات ان سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ سین فرینسسکو کی دو
جامعات ہیں اور دونوں نہایت خوش وضع ہیں۔ برکلی (Berkeley) میں کیلیفورنیا
کی اسٹیٹ یونیورسٹی اسی نام کے خلیج کے سامنے ایک پرفضا مقام پر واقع
ہے۔ اسٹینفرڈ (Stanford) کی پرائیویٹ جامعہ کے محل وقوع
کے ساتھ نو ہزار ایکڑ زمین شامل ہے جس میں سے دو ہزار ایکڑ پر ہسپانی طرز کے
خوبصورت یکمنزلہ مکان تیار ہو چکے ہیں۔ طلبا کے رہنے کی شاندار عمارتیں
ہیں اور اساتذہ کی سکونت کے لئے ایک وسیع خطہ پر خوشنما مکانات قائم ہیں
فارغ التحصیل طلبا یہاں کی بیروزگاری کا نام کو بھی خطرہ نہیں۔ اسلئے
کہ وہ ہر قسم کی خدمت کے لئے تیار ہیں خواہ دماغی ہو کہ دستی صنعت و
حرفت کے تمام سررشتے ان سے معمور ہیں اور ان کے بانی خود فارغ التحصیل
طلبا ہی ہیں۔ پورے تعلیمی نظام میں ابتدائی جماعتوں سے لیکر جامعہ تک
سوشیل سائنسز پر پوری توجہ مبذول ہے۔ معاشیات پولیٹیکل سائنس انتھروپالوجی
(علم الانسان) اور نفسیات کی تعلیم کا کافی انتظام ہے۔ امریکہ چین اور روس جیسے بڑے
ملکوں کے تمدنوں کی تعلیم یورپ کی جامعات میں ناقص طریقہ پر ہوتی ہے۔
لیکن امریکہ میں یہ نقائص دور کئے جا رہے ہیں اور دنیا کے مختلف حصوں جیسے
چین، روس، جنوبی امریکہ، ریاستہائے بلقان بلکہ برما تک کے حالات سے بطور
خاص واقفیت حاصل کرنے کی غرض سے چیدہ چیدہ جامعات کو معین کر دیا جا رہا ہے
گزشتہ تین سال میں کلچر (موسیقی، عجائب خانہ جات، پکچر گیلریز اور
خالص امریکی فن تعمیر میں بہت ترقی ہوئی ہے۔ وسکونسن (Wisconsin)
کی اسٹیٹ یونیورسٹی میں بمقام میڈیسن (Madison) پروفیسر فلسفہ
کے ساتھ نو ہمہ وقتی استاد شریک ہیں اور کوئی ایک ہزار طالب علم کو اس

مضمون کی تعلیم دیتے ہیں۔ فن لطیفہ ( Art ) کی تاریخ کا پروفیسر ایک مشہور ماہر فن ہے اور اس کے ساتھ بارہ لکچرار و معلم مصروف کار ہیں اور چھ سو طالب علموں کو پڑھاتے ہیں۔

الغرض امریکہ میں ماہران سائنس امریکی صنعت و حرفت کو اعلیٰ درجہ کے تحقیقاتی نتائج سے مستفیض کر رہے ہیں اور امریکی معیار زندگی کو ترقی دے رہے ہیں لیکن یہ امر ہنوز مشتبہ ہے کہ آیا سوشیل سائنس کی تعلیم سے وہاں کی سیاسی و اقتصادی زندگی خاطر خواہ ترقی کر رہی ہے۔ اندیشہ ہے کہ جامعی تعلیم ضرورت سے زیادہ طلبا کو دی جا رہی ہے۔

سوویٹ روس ( U.S.S.R. ) میں ریسرچ کی اعلیٰ پیمانہ پر تنظیم مارشل اسٹالن Marshal Stalin نے اپنی پہلی آل یونین کانگریس All Union Congress میں کہا تھا کہ سرمایہ داری Capitalism جاگیرداری Feudalism کی جگہ اس لئے قائم ہوئی کہ اس سے محنت یا مزدوری زیادہ بارآور بنائی جا سکی۔ سوشیلزم (اشتراکیت) سرمایہ داری پر اس لئے غالب ہو جائے گی کہ اس کے ذریعہ محنت بہتر نوع کے اور زیادہ بارآور کام کر سکتی ہے۔ لینین ( Lenin ) کے زیر ہدایت سوویٹ روس کی سائنس کی اکیڈیمی نے ملک کے فطری بارآور قوتوں کی باضابطہ پیمائش ( Survey ) کا آغاز کیا۔ سپریم کونسل آف نیشنل ایکونومی (Supreme Council of National Economy) کے زیر ہدایت متعدد اختصاصی کمیشن قائم ہوئے جن سے روس کی صنعتوں کی تنظیم جدید اور ملک کے اقتصادی پایہ کو مرتفع کرنے کا پلین ( Plan ) تیار ہوا۔

سوویٹ کی اکیڈیمی آف سائنس ایک قومی تنظیم اور رہنمائی کرنے والی

جماعت کی شکل اختیار کی ۱۹۲۴ء میں اس اکیڈمی کے علاقہ میں (۷۶) ادارے (Institutes) ۱۱ تجربہ خانے ۴۲ ریسرچ اسٹیشن، ۶ رصدگاہیں اور ۴۲ عجائب خانے تھے۔ اسکے مکمل ممبروں کی تعداد (۱۱۸) تھی۔ اعزازی ممبران کی ۵ اور خط و کتابت کرنے والے (Corresponding) ممبروں کی تعداد ۱۸۲ تھی اور سائنٹیفک اور ٹکنیکل ملازمین کی تعداد (۴۷۰۰)

سوویٹ کے سائنسی ریسرچ کے اداروں کی بیشتر تعداد حفظانِ صحت، غذا، مشینی صنعت، کیمیائی صنعت، تعلیم وغیرہ کے مختلف پیپلس کیساروں اور ان کے تنظیمات سے (مثلاً جامعات People's Commissars اسٹیٹ ٹرسٹس (State Trusts) فیکٹریاں۔ حکومت کے مزرعے اور کمیونل اور اجتماعی ادارے سے متعلق کردی گئی ہے۔ اکیڈمی کے خاص اپنے ادارے جیسے جامعاتی تجربہ خانے اساسی تحقیقاتی مسائل کے حل میں مصروف ہیں اور باقی دوسرے ادارے ان کے عملی اطلاقات پر لگے ہوئے ہیں۔

اکیڈمی تمام ملک کی ساری سائنٹیفک تحقیقات کے منصوبے (Plan) بھی تیار کرتی ہے اور ان کی تنظیم کی نگرانی کرتی ہے۔ اکیڈمی کے منصوبے اسٹیٹ پلننگ کمیشن GOSPLAN (State Planning Commission) کے منصوبوں کے ساتھ پورا ربط رکھتے ہیں۔ سوویٹ یونین جن اصول کے تحت وجود میں آئی ان کے لحاظ سے ملک کے ماہران سائنس کو فوری عملی مسائل پر ہی توجہ کرنا پڑتا ہے۔ اس کی کامیابی روس کے تمام اہلِ سائنس کے خود ارادی اشتراک عمل کا نتیجہ ہے۔ سائنس کی تنظیم ملک کے اقتصادی ضروریات کے تابع ہے، اصل مقصد نہیں بلکہ حصول مقصد کا ذریعہ ہے۔

اس سے واضح ہے کہ موجودہ متمدن دنیا میں سائنس کو کس قدر اہمیت

حاصل ہے۔ یہ اہمیت نہایت تیز رفتار سے بڑھتی جا رہی ہے۔ خدا معلوم کہاں پہنچ کر ٹھیرے گی۔ جب سے انسان کو جوہری توانائی پر دسترس حاصل ہوا اور جوہری بمب تیار ہونے لگے بلا مبالغہ دنیا کی سیاسی اقتصادی اور اخلاقی ہیئت ہی کچھ اور ہو گئی۔ ہیروشیما اور ناگاساکی کی ہولناک تباہیوں کے بعد برطانوی مشن جاپان نے جو رپورٹ شائع کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اول الذکر شہر کی تین لاکھ بیس ہزار آبادی میں سے صرف ایک جوہری بمب کے گرنے سے اسّی ہزار انسان مارے گئے۔ ثانی الذکر شہر کی آبادی دو لاکھ ساٹھ ہزار تھی۔ اس پر جب بمب گرا تو چالیس ہزار انسان راہی ملک عدم ہوئے۔ مالی نقصانات کا اندازہ بھی اسی پیمانہ پر ہوا ہے۔ ان عالمگیر تباہیوں سے متاثر ہو کر امریکہ اور برطانیہ کے مذہبی ادارے مابعد جنگ تعلیم و تربیت سے متعلق جو منصوبے تیار کر رہے ہیں ان کے ساتھ چند ایک مقالے بھی شائع ہوئے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ مہذب دنیا ڈر رہی ہے کہ موجودہ سیاسی و اقتصادی ذرائع نوع انسان کی محافظت کے لئے کافی نہیں ہیں۔

جب تک مذہب کے زیر ہدایت ذہنیت و اخلاق کی تربیت نہ ہو اور احکام الٰہی کی تعمیل میں انسان اپنے نفس کے سوائے دوسروں کے حق زندگی کو کامل خلوص کے ساتھ تسلیم نہ کرے جنگ و جدل اور قتل و خون کا سلسلہ ختم نہ ہوگا بلکہ شائد بڑھتا ہی جائے۔ حتیٰ کہ نوع انسان مفقود ہو جائے جیسا کہ ہاؤس آف لارڈز کے ایک ڈبیٹ میں لارڈ رسّل (Lord Russell) نے بیان کیا۔

اس ضمن میں Students' Christian Movement Press (S.C.M. پریس) کا مطبوعہ رسالہ The Era of Atomic Power

پڑھنے اور پڑھ کر غور کرنے کے قابل ہے۔ کرسچین ایجوکیشن پر ،
(The archbishops call to Actoin) کے عنوان سے
اے۔ ای۔ آئکن (A.E. Ikin) نے بھی ایک مختصر رسالہ
لکھا ہے۔ اور مذہبی تعلیم (Religious Instruction) کے نام سے
عیسائی مذہب والوں کے لئے تین جلدوں میں توریت و انجیل کی تاریخ کی
روشنی میں تصریح کی ہے۔ یہ ایک خوش آئند اقدام ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ
دیگر مذاہب کے علماء بھی اس بدلی ہوئی دنیا کے خطرناک رجحانات سے
بچانے کے لئے نوجوان طالب علموں اور غیر تعلیم یافتہ بالغوں کو اپنے اپنے
مذہب کی طرف راغب کرانے کی کوشش کریں گے اور بتائیں گے کہ دنیا
اگر کامل تباہی سے بچ سکتی ہے تو مادی تعلیم کے ساتھ صحیح مذہبی تعلیم ہی کے
ذریعہ بچ سکتی ہے۔

# ضمیمہ

ذیل میں ہم ارنسٹ گرین (Ernest Green) کی کتاب ”نئی سوسائٹی کے لئے تعلیم“ (مطبوعہ اپریل ۱۹۴۳ء جارج روٹلیج) کے جو برطانوی عوام الناس کو تعلیم سے دلچسپی پیدا کرنے کے لئے لکھی گئی چند اقتباس بطور ضمیمہ شامل کرتے ہیں

## (۱) انگلستان کے نظام تعلیم کی تاریخ

ہر شخص کو اس سے اتفاق ہے کہ تعلیم منفرد انسان کے طرز روش اور کردار کو سدھارتی اور قوم وملت کی اقتصادی ومعاشرتی زندگی کو ابھارتی ہے۔ کامیابی کی حد تعلیم کی پالیسی چلانے اور روپیہ خرچ کرنے والی مقتدر جماعت کی کوشش پر منحصر ہے۔ برطانیہ میں پہلے یہ جماعت مذہبی اداروں پر مشتمل تھی۔ بیسویں صدی میں حکومت بھی اس کے اندر داخل ہو گئی۔

حالیہ نظام تعلیم کے نقائص کا باعث، حکومت کے اصلاح نظام تعلیم کی ذمہ داری کے عدم احساس سے کہیں زیادہ پارلیمنٹ کے اندر اور باہر عمل کرنے والی خود غرض قوتوں کی مخالفت ہے جس کی وجہ سے حکومت اور عوام کی پیش کردہ متعدد تجاویز الٹ دی گئیں اور تعلیم ترقی سے محروم رہی۔ گرین اپنی کتاب میں حکومت پر نکتہ چینی کرنے سے احتراز کرتے ہوئے کہتا ہے کہ حکومت شاذ ونادر ہی اصلاحی کاموں میں تقدیم کرتی ہے۔ عوام ہی کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ ابتدائی تعلیم

کے لئے حکومت کی پہلی امداد بقدر بیس ہزار پونڈ ۱۷ اگست ۱۸۳۳ء کو منظور ہوئی تاکہ پرائیویٹ چندوں سے غریب طبقہ کے بچوں کی تعلیم گاہوں کے مکان تیار کرانے میں مدد دی جا سکے۔

اس سے قبل بھی پبلک کی طرف سے تعلیم کی خدمت کے لئے کوشش کی جا رہی تھی۔ چنانچہ ۱۸۱۱ء میں غرباء کو مسلمہ دین عیسوی کے اصول کی تعلیم دلانے کی قومی سوسائٹی the Principles of the Established Church National Society for Education of the poor in تشکیل پا چکی تھی۔ ۱۸۱۴ء میں برطانوی اور غیر برطانوی مدارس کی سوسائٹی British and Foreign Schools Society قائم ہوئی۔ ان سے بہت قبل ۱۶۹۸ء میں ایس۔ پی۔ سی۔ کے (سوسائٹی برائے ترقی علوم عیسوی S.P.C.K.) کے زیر ہدایت جاری کردہ خیراتی مدرسے کھولے جا چکے تھے۔ فرقہ وارانہ مذہبی (Denominational) تعلیم کے حامیوں نے بھی تعلیم کی بہت خدمت کی۔ انیسویں صدی میں صنعتی کارخانوں میں چھوٹے بچوں اور بچیوں سے ان کی قوت سے زیادہ محنت لینے اور ان کے تنگ و تاریک گھروں میں پرورش پانے سے جو جسمانی، ذہنی اور اخلاقی برائیاں پیدا ہو رہی تھیں ان کو رفع کرنے کی خاطر پارلیمنٹ نے ۱۸۰۲ء میں صحت و اخلاق کا ایکٹ (Health and Morals Act) جاری کیا تاکہ کارخانوں میں بچوں سے صرف دن کے وقت بارہ گھنٹوں سے زیادہ کام نہ لیا جائے اور رات کو وہ کچھ کام نہ کریں۔ ساتھ ہی انھیں کچھ پڑھنا لکھنا اور حساب سکھایا جائے اور اتوار کے دن وہ گرجا جانے پر مجبور کئے جائیں۔ اس کا نام پہلا فیکٹری ایکٹ رکھا گیا مگر انسپکٹروں کے تقرر کے لئے کوئی گنجائش منظور نہیں کی گئی۔ اس لئے مختلف

ذاتی اغراض کی بنا پر کسی شخص نے اس پر عمل نہیں کیا۔
مذہبی ادارے ہوں کہ غیر مذہبی، ان کی طرف سے غریب طبقہ کے بچوں کی تعلیم اور اصلاح اخلاق کی جو بھی کوشش کی گئی۔ اس طبقہ کو ہمیشہ مطیع و فرماں بردار رکھنے کی غرض سے کی گئی نہ کہ محض کار خیر انجام دینے کی نیت سے۔ چنانچہ آرتھر ینگ نے اپنی کتاب "ادنیٰ طبقوں کی ذہنی حالت کی تحقیق" (Inquiry into State of Mind of the Lower Classes) ۱۷۹۸ء میں صاف لکھا ہے کہ اس نے عوام کی تعلیم کی اس لئے تائید کی ہے کہ مذہبی تعلیم انسان کو اپنے سے بالاتر قوتوں کی اطاعت و فرماں برداری سکھاتی ہے۔ چارلز ڈکنز (Charles Dickens) نے بھی اپنے ناولوں مثلاً ڈومبی اینڈ سن (Dombey and son) میں بخوبی بتایا ہے کہ دولتمند طبقہ اسی ذہنیت کے تحت عوام کی تعلیم پر اپنی رضامندی ظاہر کرتا تھا۔ تعلیم کے ساتھ غریبوں کے بچوں کو اپنے والدین کی غربت اور محتاجی کا احساس برقرار رکھنے کے لئے ان کو خاص قسم کا خیراتی لباس پہننے اور اس پر نمبر لگائے رکھنے پر اصرار کیا جاتا تھا۔
سر رابرٹ پیل (Sir. R. Peel) نے ۱۸۰۲ء کا ایکٹ نافذ کیا اور اعتراف کیا کہ خود اس کے پارچہ بافی کے کارخانوں میں ایک ہزار غریب بچے نوکر تھے جن کی صحتیں خراب ہو چکی تھیں۔ پیل بذات خود اپنی دیگر مصروفیتوں کی وجہ سے اس جانب کوئی توجہ نہیں کر سکتا تھا۔ ۱۸۰۷ء تک ملک کے تمام بچوں کی تعلیم کا خیال پیدا نہیں ہوا۔ اس سال مسٹر وہٹ بریڈ (Whitbread) نے پارلیمنٹ میں ایک بل پیش کیا جس میں بتایا گیا کہ جوزف لنکسٹر (Lancaster) ایک کویکر (Quaker) کی مجوزہ اسکیم کے بموجب مونیٹوریل (Monito-rial) تعلیم پر سالانہ فی بچہ پانچ شلنگ سے زیادہ صرف کرنے کی ضرورت

اس لئے اس بل کا نام مذاقاً فائیو بوب اے نوب ( Five bob a nob )
بل چلا آیا۔ بعد کو ڈاکٹر اینڈ روبل ( Andrew Bell ) نے بھی جو پہلے
کئی سال تک ہندوستان کے ایک یتیم خانہ کا منتظم تھا اس طریقۂ تعلیم کو انگلستان
واپس جا کر اختیار کیا۔

لنکسٹر خود ایک خیراتی مدرسہ کا تعلیم یافتہ اور بید کی چھلنیاں بننے والے
نان کنفرمسٹ باپ کا بیٹا تھا۔ بیس برس کی عمر میں اس نے سدرک ( Southwork )
میں کو یکروں کے چندے سے ایک "مدرسہ" کھولا جو صرف ایک بڑا کمرہ تھا جس میں کئی
سات سو بچے مختلف سو نیٹروں کے تحت دس دس کی ٹولیوں میں لکھنا پڑھنا
سکھائے اور حساب رٹائے جاتے تھے۔ یہ طریقہ اتنا کامیاب تصور کیا گیا کہ
نان کنفرمسٹ ( Nonconformists ) اور سوشیل رفارمروں نے اسے
دل کھول کر اختیار کر لیا اور بعد برٹش اور فارین اسکول سوسائٹی کی بنیاد اسی
طریقہ پر قائم کی گئی۔ یہاں مذہبی تعلیم بھی دی جاتی تھی مگر غیر فرقہ وارانہ حکومت کے
مسلمہ مذہبی عقائد پر اصرار کرنے والی جماعت نے ڈاکٹر بل ( Bell ) کے
مونیٹوریل طرز تعلیم کے ساتھ ان عقائد کی تعلیم کو بھی بتوسط "غرباء کو مسلمہ دین عیسوی
کے اصول کی تعلیم دلانے والی قومی سوسائٹی" ( the Principles of the Established Church -
National Society for the Education of the Poor in )
جاری کرایا۔ اسی وجہ سے بعد کو مذہبی فرقہ وارانہ تعلیم کا سوال پیدا ہوا۔

وہیٹ بریڈ کا بل غریب بچوں کو صرف دو برس تعلیم دلانے کا محرک تھا
جس کے لئے فی بچہ بحیثیت مجموعی صرف دس شلنگ کی ضرورت تھی لیکن اس
قلیل رقم کی تحریک کی بھی نہایت سختی کے ساتھ مخالفت کی گئی۔ پارلیمنٹ کو
پست طبقات کی تعلیم کے مسئلہ پر بحث کرنے کے پہلی مرتبہ مجبور کرنے کے لئے

وہٹ بریڈ کو یہ مشہور استدلال پیش کرنا پڑا کہ اگر مدرسے میں بچوں کی تعلیم کا انتظام نہ کیا جائے تو موری ( Gutter ) ان کو تعلیم دے گی۔ اس پر دارالعوام (ہاؤس آف کامنز) نے تو بل کو پاس کر دیا مگر یہ جان کر کہ دارالامراء ( House of Lords ) میں وہ مسترد کر دیا جائے گا چنانچہ بعد کو ایسا ہی ہوا۔ خود اسقف اعظم (آرچ بشپ آف کنٹربیری) نے اس کی مخالفت کی اور بل کی تائید میں صرف دو رائیں حاصل ہوئیں۔ گڈی ( Giddy ) نامی پریزیڈنٹ رائل سوسائٹی نے بل کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ تعلیم غریبوں کو اطاعت گزاری کے عوض سرکشی سکھائیگی اور وہ باغیانہ خیالات اور عیسائیت کے خلاف شائع کردہ مطبوعات پڑھنے لگیں گے۔

وہٹ بریڈ ۱۸۱۵ء میں مرگیا۔ اس کے دوسرے سال لارڈ براوہم Brougham نے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کرنے پر راضی کرایا۔ دو سال بعد اس کمیٹی نے پارلیمنٹ کو پست طبقہ والوں کی تعلیم کے مسئلہ پر غور کرنے کیلئے ایک کمیٹی مقرر کرنے پر راضی کرایا۔ دو سال بعد اس کمیٹی نے حکومت کو تعمیر امکنہ مدارس کے لئے رقمی امداد کا مشورہ دیا۔ اس نے ۱۸۲۰ء میں براوہم نے پیش کیا کہ مقامی صناع ان مدارس کی تعمیر کے لئے چندہ دیں اور سالانہ محصول میں تعلیم کے اخراجات کو بھی شامل کیا جائے۔ مدرسین کا تقرر کلیسا church کی جانب سے ہو جن کی تنخواہ بیس پونڈ سالانہ سے تیس پونڈ تک ہو اور انہیں رہنے کے لئے گھر بھی مہیا کیا جائے۔ اہل کلیسا ( clergy ) ہی نصاب تعلیم تیار کریں اس بل کی مختلف ذاتی اغراض کی بنا پر ہر طرف سے مخالفت کی گئی۔ اگرچہ اس کی دوسری قرارت کی بھی نوبت آئی لیکن بعد کو بل واپس لے لینا پڑا۔ اس موقعہ پر ایک غریب طبقے کے نیک نیت روشن خیال خود ساختہ شخص کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ لارڈ براوہم نے اسی سے تاثرات قبول کئے۔ رابرٹ اوین انگلستان میں باہمی امداد اور اشتراکیت

(Socialism) کی تحریکوں کا موجد تھا۔ اگرچہ دس برس کی عمر تک ہی اس نے تعلیم پائی۔ اپنی ذاتی محنت اور کوشش سے کافی دولت کمائی اور دل کھول کر غربا کے رفاہی کاموں میں روپیہ خرچ کیا۔ لنکسٹر کے تعلیمی منصوبوں کی عملی اجرائی میں اس نے بڑی رقمی مدد دی۔ ۱۸۱۶ء میں اپنے ملز (Mills) کارخانوں واقع لینارک (Donark) میں کام کرنے والے بچوں کی تعلیم کا مشہور تجربہ شروع کیا۔ براوہم اس مدرسہ اور وہاں کے طرزِ تعلیم کو دیکھکر بہت متاثر ہوا اور اس اثر کے تحت اپنا بل پیش کیا۔ فرانسیس پلیس (Place Francis) کو رابرٹ اوین کی تحریرات پڑھنا پڑتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ان کو صحیح بھی کرتا تھا۔ اگرچہ اوین (Owen) کی کوشش زیادہ تر ذی اقتدار تعلیم یافتہ طبقہ اور ارکان پارلیمنٹ کو اپنی تجربات کے ذریعہ غربا کی تعلیم کی طرف مائل کرانے ہی پر صرف ہوتی رہی۔ سوائے براوہم کے بہت کم لوگوں نے اس طرف توجہ کی۔ اس کے کامیاب تعلیمی تجربہ کو دیکھ بالآخر مزدوری پیشہ لوگوں میں ہلچل پیدا ہوگئی۔ امداد باہمی، چارٹسٹ (Chartist) اور ٹریڈ یونین تحریکوں کے قائدین نے اوین کی تعلیمات کو اس کے طریقۂ عمل کے ساتھ اختیار کرلیا۔

۱۸۳۳ء میں حکومت اپنی سب سے پہلی بیس ہزار پونڈ کی امداد عوام کی تعلیم کے لئے منظور کی۔ اگرچہ اسی سال اسی پارلیمنٹ نے شاہی اصطبلوں کی درستی کے لئے پچاس ہزار پونڈ منظور کئے۔ اس قلیل امداد سے عوام کو اپنی تعلیم کے لئے مملکت پر ایک طرح کا حق حاصل ہوگیا۔ روشن خیال اہلِ قلم میں سے تھا مس کارلائیل (Carlyle) جان رسکن (Ruskin) جیریمی بنتھم (Bentham) چارلز ڈکنز (Dickens) جان سٹیورٹ مل

( Mill ) ولیم لوویٹ ( Lovett ) اور جان روبک ( Roebuck ) نے بھی مزدور پیشہ عمال کے اس مطالبہ کی تائید کی۔ ۱۸۳۹ء تک ہر سال بیس ہزار پونڈ ہی منظور ہوتے رہے۔ اس سال دو آرار کے غلبہ سے رقم تیس ہزار پونڈ کر دی گئی۔ اگرچہ براہم نے تین مرتبہ کوشش کی کہ برطانیہ میں ایک قومی نظام تعلیم جاری کیا جائے اور ایک خاص کمیٹی نے اطلاع دی کہ بڑے شہروں میں بھی ہر چوبیس افراد کے منجملہ صرف ایک فرد کو حقیقی معنوں میں کارآمد تعلیم ملتی تھی بلکہ بعض جگہوں پر چالیس میں ایک کو کمیٹی نے خود ارادی طریقہ تعلیم ہی کو برقرار رکھنے کا مشورہ دیا۔ البتہ نیشنل سوسائٹی اور برٹش انڈیا فارین اسکولز سوسائٹی کے امدادی رقوم میں کچھ توسیع کرنے کی سفارش کر دی۔

اس اثنا میں ۱۸۱۹ء کا فیکٹری ایکٹ ۹ برس سے کمتر برس عمر کے بچوں کو نوکر نہ رکھنے اور ۹ اور ۱۶ برس کی عمر والوں سے ۱۳½ گھنٹوں سے زیادہ مدت تک روزآنہ کام نہ لینے کی نسبت نافذ ہوا۔ اس مدت میں ½۱ گھنٹہ کھانے کے لئے خالی رکھا گیا۔ لیکن افسوس ہے کہ اس ایکٹ کے احکام کی سختی سے تعمیل نہیں کرائی گئی۔ ۱۸۳۳ء کے ایکٹ کے بموجب بچوں کو روزانہ دو گھنٹے تعلیم دینے کی شرط عائد کی گئی اور فیکٹری اور اسکول کے انسپکٹروں کے تقرر کے لئے بھی گنجائش رکھی گئی۔ اس کا نفاذ تین برس شور مچانے کا نتیجہ تھا جس میں روزانہ کام کی مدت کو دس ہی گھنٹے مقرر کرنے کی تحریک کی گئی تھی۔ اس احتجاج سے پارلیمنٹ پر کافی دباؤ پڑا۔ سر جان گریہم (Graham) کنزرویٹو حکومت کے ہوم سکرٹری نے ۱۸۴۳ء میں ایک جدید فیکٹری بل نافذ کیا جس کے لحاظ سے اون، فلیکس اور روئی کے کارخانوں میں کام کرنے والے بچوں کو جبراً تین گھنٹے روزآنہ درس دینا لازمی قرار دیا گیا اور ۸ سے ۱۳ برس کی عمر والوں کیلئے

روزانہ کام کی مدت ۶ ½ گھنٹے مقرر کی گئی۔ مدارس انگلستان کے مسلّمہ عیسوی مذہب (Church of England) کا شخص ہونا لازمی گردانا گیا البتہ ان کنفر مسٹ بچوں کو کلیسا میں عبادت سے مستثنیٰ کیا گیا۔ مدارس کی نگرانی کچھ پبلک کے نمائندوں کے بھی تفویض کی گئی۔ اس پر بھی مذہبی فرقہ واری جماعتوں کی جانب سے سخت اعتراضات پیش ہوئے اور بارہ سال تک پارلیمنٹ خاموش رہی۔

اس اثنا میں حکومت کی مقرر کردہ تعلیمی امداد کی رقم میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ پھر یہ سوال اٹھایا گیا کہ آیا سابقہ خود ارادی طریقہ تعلیم کو برقرار رکھا جائے یا حکومت قومی تعلیم کا بوجھ اپنے ذمہ لے لے۔ اکثر لبرل ارکان اسی سری رائے کے حامی تھے۔ مگر گلیڈسٹون کی حکومت پہلی تجویز کی طرف مائل تھی۔ بالآخر فورسٹر (Forster) کا ایجوکیشن ایکٹ (۱۸۷۰ء) خود ارادی طریقہ تعلیم کے مدارس کو برقرار رکھتے ہوئے میونسپل (بلدی) بروز (Boroughs) کو مدارس کے امکنہ کی کمی دور کرنے کا مجاز گردانا۔

اسکول بورڈ قائم کرکے تعلیم کے لئے محصول وصول کرنے کی اجازت دی گئی۔ اور ۵ سے ۱۲ برس کی عمر کے بچوں کی مدارس میں حاضری کی قید نافذ کی گئی۔ لیکن اس سے جبری تعلیم مقصود نہ تھی۔ جبری حاضری ۱۸۷۶ء میں نافذ ہوئی اور ۱۸۹۹ء میں ترک مدرسہ کی عمر ۱۲ سال کردی گئی۔ ان انتظامات سے ملک میں دو قسم کی تعلیم کے طریقے رائج ہوئے جو تا حال چلے آرہے ہیں۔ لبرل پارٹی مقامی محصول عائد کرکے فرقہ واری مدارس اور توسیع کی سخت مخالف تھی۔ مگر اس قسم کی امداد کے عوض حکومت کی طرف سے مزید عطیے جاری کئے گئے۔ فرقہ واری تعلیم کے حامیوں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور خود ارادی طریقہ تعلیم کی آڑ میں تعمیر امکنہ کی رقموں کا دو تہائی حصہ حاصل کرلیا۔ اسکول بورڈ تعلیم کی اس دوڑ میں پیچھے رہ گئے۔ بچوں کی

حاضری اور مستثنیات کی تفصیل میں جانے کی ہمیں ضرورت نہیں صرف اتنا کہدینا کافی سمجھا جاتا ہے کہ قومی تعلیم اور فرقہ وارانہ تعلیم کی اس مسابقت میں ۱۸۹۹ء میں حکومت نے بورڈ آف ایجوکیشن قائم کیا جس کا پریذیڈنٹ پارلیمنٹ کو جوابدہ ٹھیرایا گیا۔ خواہ براہ راست یا بتوسط اپنے پارلیمنٹری معتمد کے بورڈ کی مدد کیلئے ایک مجلس مشاورت بھی قائم کی گئی۔

تین سال بعد ۱۹۰۲ء میں بیلفور (Balfour) ایجوکیشن ایکٹ نافذ کیا گیا جس سے ہر بچہ کی (خواہ غریب کا ہو یا دولتمند کا) مفت ابتدائی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔

اس ایکٹ سے کاونٹی اور بَرو بالکلیہ تعلیم کے لئے گنجائش فراہم کرنے کے ذمہ دار گردانے گئے۔ ہزاروں اسکول بورڈ اور حاضری طلباء کی کمیٹیاں مسدود کر دیئے گئے اور ان کی جگہ تین سو سے زیادہ مقامی مجالس مجاز قائم کی گئیں۔ ثانوی اور فنی تعلیم کے لئے بھی گنجایش نکالنے کی کوشش کی گئی مگر ناکافی۔ پھر بھی ملک کا قدیم ڈھیلا اصول تعلیم برقرار رہا۔

صرف ایک ہی طریقہ کے لئے بارہا کوشش کی گئی مثلاً ۱۹۰۶ء کی لبرل گورنمنٹ میں مسٹر بیریل (Augustine Birrell) اور بعد کو مسٹر میک کنا (Mc. Kenna) نے اس جانب قدم اٹھایا۔ مگر یہ کوششیں بھی کارگر ثابت نہ ہوئیں۔

اسی زمانہ کے تعلیمی مباحث میں یہ بات واضح ہوگئی کہ دماغی تعلیم کے ساتھ بچہ کی جسمانی صحت کو بہت قریبی تعلق ہے۔ جنوبی افریقہ کی ۱۹۰۸ء والی جنگ میں فوجی بھرتی کے لئے جو امیدوار پیش ہوئے تھے ان میں سے ربع سے زیادہ جسمانی ناقابلیتوں کی وجہ سے مسترد کر دیئے گئے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر نمو کے زمانہ میں ان کی اچھی نگہداشت

یکجا تی تو یہ نقص ان میں پیدا نہ ہوتا۔ ۱۹۰۶ء کے ایکٹ سے بچوں کے لئے مدرسوں میں سستے رسٹورنٹ ( Canteen ) کھولنے کا انتظام کیا گیا۔ اگرچہ ابتداً اس کے لئے فی پونڈ اسٹرلنگ نصف پینی سے زائد رقم منظور نہیں کی گئی۔

۱۹۰۷ء میں مناسب وقفوں سے مدارس کے بچوں کے طبی معائنہ کی ذمہ داری بانیان مدرسہ پر عائد کی گئی اور بورڈ تعلیم (Board of Education) کی طرف سے ایک محکمہ صدر افسر حفظان صحت کے ساتھ قائم کیا گیا۔

۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۸ء تک چھ سال کی مدت میں قومی تعلیم کا نظام مستحکم بنیاد پر قائم ہو گیا۔ اور اس کی کامیابی کے لئے متعلقہ معاشرتی اور اقتصادی فضا رکھی تیار کی جانے لگی۔ اس کا باعث زیادہ تر پارلیمنٹ میں چالیس حزب العمال ( Labour ) کے ارکان کا ورود تھا جن کی تعلیم خود بورڈ تعلیم اور مدارس شبینہ کے ذریعہ ہوئی تھی۔ شبینہ مدارس کی نیو کاسٹل ( Newcastle ) کمیٹی نے سفارش کی اور پریوی کونسل کی کمیٹی نے اس کو منظور کر لیا تھا۔ ساتھ ہی بارہ برس کی عمر سے زائد کے بچوں کی اس طرح کی تعلیم کے لئے بھی کچھ امداد مقرر کی گئی۔

۱۹۰۲ء کے بیلفور ( Balfour ) ایجوکیشن ایکٹ سے محصولات میں ایک پینی کا اضافہ کیا جا کر ایلیمنٹری تعلیم کے علاوہ فنی تعلیم کے لئے بھی گنجایش نکالی گئی۔ پھر بھی سن بلوغ کو پہنچنے والے بچوں کو اس تعلیم سے استفادہ کا چنداں اشتیاق پیدا نہ ہوا۔ انیسویں صدی کے ختم تک برطانیہ میں عوام الناس تعلیم کا مذاق اڑاتے تھے اور محنت پیشہ لوگ کوشاں رہتے تھے کہ ان کے بچے جہاں تک ہو سکے مدرسوں میں کم سے کم مدت تک شریک رہیں۔ بچے خود مدرسوں سے بیزار تھے اور وہاں سے نکلنے کا جب زمانہ آتا تو خوشیاں مناتے۔

اگرچہ شام کے مدارس کے قانون ( Code ) سے عوام کو ۲۱ برس کی عمر تک شرکت کی اجازت حاصل تھی اور اس کے لئے ان کو رقمی امداد بھی دیجاتی تھی۔ ان کا مجموعہ ۱۴ تا ۱۸ سال کی عمر والے نوجوانوں میں سے صرف ۲۰ فیصد کو ان مدارس کی طرف مائل کرتا تھا۔ ۱۹۱۴ء تک یہی حالت رہی۔

۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۴ء تک برطانیہ کی تعلیمی فضا میں بڑی سرگرمی رہی۔ کئی ہڑتالیں ہوئیں۔ لیبر تحریک کو تشدد ہوا۔ شمالی آئرلینڈ میں فسادات برپا ہوئے۔ بالآخر ۱۹۱۳ء میں مسٹر پیز ( Pease ) نے ثانوی اور فنی تعلیم کی اجرائی اور ایلیمنٹری تعلیم کی اصلاح سے متعلق بل نافذ کیا۔ اتنے میں پہلی عالمگیر جنگ چھڑ گئی اور تمام رفاہی کام رک گئے۔

دوسری عالمگیر (۱۹۳۹ء) کی جنگ میں برطانیہ کے ہر طبقہ کے لوگ جس مستعدی سے لڑائی کے لئے تیار ہوئے ۱۹۱۴ء کی جنگ میں ایسا نہیں ہوا۔ لیبر تحریک میں خود پھوٹ پڑی تھی اور اگرچہ پارلیمنٹ کے لیبر ارکان ۱۹۱۵ء کی مشترک ( Coalition ) گورنمنٹ میں شامل ہو گئے۔ صنعتی بے چینی جاری رہی۔ جب لائیڈ جارج کی حکومت کی طرف سے قوم کو اطمینان دلایا گیا کہ تعلیم عام کر دی جائے گی اور مسٹر فشر ( H.A.L.Fisher ) وائس چانسلر جامعہ شیفیلڈ بورڈ تعلیم کے پریذیڈنٹ بنائے گئے تو جنگ کے مساعی میں تمام طبقوں کے لوگ شریک ہوئے۔ برطانیہ کے سیاسی جماعت وار ( Party ) نظام حکومت میں یہ پہلی نظیر تھی کہ سیاسی جماعتوں سے بے تعلق ایک خالص ماہر تعلیم کا تقرر تعلیم کی سب سے اہم خدمت پر عمل میں آیا۔ مسٹر فشر نے ۱۹۱۸ء کا تعلیمی بل نافذ کر کے مدرسین، نظم و نسق تعلیم اور خود تعلیم پانے والے بچوں کے لئے ۱۴ سال کی عمر تک خالص بلا ملازمت نصف یوم تعلیم رائج کی گئی بلکہ (لوکل ایجوکیشنل اتھارٹیز

(L.E.A) مقامی تعلیمی مجازوں کو ذیلی قواعد نافذ کر کے بچوں کی مدت تعلیم ۱۵ سال کی عمر تک جاری رکھنے کا مجاز گردانا گیا (لیکن افسوس ہے کہ صرف دو یا تین مقامی مجازوں نے ہی اس پر عمل کیا۔) بارہ ۱۲ برس سے کمتر عمر کے بچوں کو کسی قسم کی ملازمت میں ڈالکر ان کی جسمانی محنت اور کمائی سے استفادہ ممنوع قرار دیا گیا۔ اس سے زیادہ عمر والے کسی بچہ سے اتوار کا دن دو گھنٹوں سے زائد خدمت لینا بھی منسوخ کیا گیا۔ نیز صبح چھ بجے سے پہلے اور شام کے چھ کے بعد ان سے کسی قسم کی محنت لینا ناجائز قرار دیا گیا۔ اس پہ بھی بعض حیلہ جو، خود غرض لوگوں نے جنگ کے اغراض کا بہانہ کر کے بچوں سے ممنوعہ خدمت لینے کی کوشش کی اور مزدوروں کی تعلیمی مجلس (Workers' Educational Association W.E.A) وغیرہ کو اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی ضرورت پیش آئی۔

اس ایکٹ کے نفاذ کے سات سال بعد سے مسلسل جز وقتی تعلیم کو ۱۸ سال تک بھی جاری رکھنے کے لئے گنجائش مہیا کی گئی اور اس اثناء میں جز وقتی تعلیم کو بچوں کی ۱۶ برس کی عمر تک توسیع دی گئی۔ لیکن اس پر عمل نہ ہوا۔

مسٹر فشر نے مذہبی تعلیم کے مسئلہ اور ڈیلے طریقہ تعلیم کے اصول کی ترمیم سے متعلق سوالات سے اپنے آپ کو (مثل اپنے پیش روؤں کے) بالکل الگ رکھا۔ البتہ ان کے ۱۹۲۱ء کے ترمیمی ایکٹ کے ذریعہ اساتذہ کے تقرر اور معزولی کی نسبت مقامی تعلیمی مجازوں کو اصلاحی اختیارات عطا کئے گئے۔ خانگی غیر امدادی مدارس کے امکنہ کی مرمت وغیرہ اور ان کے غیر تعلیمی اغراض کے لئے استعمال کئے جانے سے متعلق بھی اصلاحات رائج کئے گئے لیکن فرقہ وارانہ مذہبی تعلیم کا مسئلہ حل نہ ہو سکا تو یہ ترمیمی بل متروک کر دیا گیا۔

اس سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوا کہ ثانوی تعلیم پر ملک آمادہ ہونے لگا۔ رائے عامہ نے ۱۹۲۷ء کی ہیڈو ( Hadow ) کمیٹی کے ذریعہ تعلیم کے پورے نظام کی از سر نو تنظیم کی طرف قدم اٹھایا اور گیارہ سال کی عمر سے پندرہ سال کی عمر تک بچوں کی مناسب فنی وغیرہ تعلیم کے لئے بھی گنجایش نکالنے کی کوشش کی۔ دو سال بعد ۱۹۲۹ء کی لیبر گورنمنٹ قائم ہوئی۔ اور سر چارلز ٹریولین ( Trevelyan ) تعلیمی بورڈ کے صدر نے اپریل ۱۹۳۱ء سے بچوں کی عمر ۱۵ سال تک مقرر کرنے کے لئے بل تیار کیا لیکن سالانہ ۵ لاکھ بچے ۱۴ برس تک تعلیم پا کر ترک مدرسہ کر کے بیروزگار رہنے کی وجہ سے بڑی دشواریاں پیش آئیں۔ اس بل میں نئے امکنہ مدارس کی تعمیر اور موجودہ امکنہ کی تجدید کے مسئلہ پر بھی غور کیا گیا لیکن غیر امدادی مدارس کی بے سرو سامانی سے پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں اور اسی دوران میں دوسری عالمگیر جنگ چھڑ گئی اس لئے یہ تمام تجاویز معطل ہو گئے
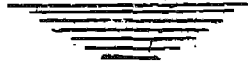
# برطانیہ کا حالیہ نظام تعلیم

برطانوی نظام تعلیم برطانوی قوم کی معاشری صورت حال کی سچی تصویر ہے۔ دولت و افلاس کے انتہائی مدارج طریقہ تعلیم میں بھی وضاحت کیساتھ نمایاں ہیں۔ بوسٹن (Boston Times) یا فالمتھ (Falmouth) کے بچوں کی تعلیم پر اگر سالانہ نو پونڈ چھ شلنگ دو پنس فی بچہ صرف ہوتے ہیں تو ایٹن (Eton) جیسے مدارس پر کم از کم تین سو پندرہ پونڈ فی بچہ صرف کئے جاتے ہیں۔ مسٹر سیبوم روان ٹری (Seebohm Rowntree) نے یورک (York) کی معاشی حالت سے متعلق "افلاس و ترقی" (Poverty of Progress) میں بتایا ہے کہ وہاں کے تمام والنٹری یعنے خود ارادی مدارس باستثنار ایک کے ۱۸۳۴ء اور ۱۸۹۰ء کے مابین تعمیر کئے گئے اور کونسل کے مدارس باستثناء دو کے ۱۸۹۱ء اور ۱۹۱۶ء کے مابین۔ اسی طرح تعلیم کے مواقع کی تقسیم میں بھی مساوات کا فقدان ہے۔ اگرچہ عمال کے طبقہ سے کئی طلباء نے اپنی ذاتی جدوجہد سے جامعات اور علم کے دیگر میدانوں میں نمایاں امتیاز حاصل کیا اور حکومت کی طرف سے تعلیمی وظائف عطا کئے جارہے ہیں۔ فیس تعلیم ادا کر کے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے سات طلباء میں سے مماثل قابلیت و ذہانت کے ایک ہی طالب علم کو معافی فیس کے ساتھ یہ نعمت نصیب ہو رہی ہے۔ مفلوک الحالی کا اثر بچوں کے جسمانی قویٰ پر بھی نمایاں ہے۔

سرجان آر ( Sir John Orr ) نے بتایا ہے کہ کرائسٹس ہوسپٹل ( Christs Hospital ) پبلک بورڈنگ اسکول کے ۱۳ سال کی عمر کے بچے عموماً ابتدائی مدارس کے اسی عمر کے بچوں سے دو انچ زیادہ اونچے ہوتے ہیں اور ۱۷ سال کی عمر کے چار انچ زیادہ اونچے۔ انفنٹ مدارس میں ۵ سال سے کم عمر کے بچوں میں ہر چھٹا بچہ طبیعی نقائص میں مبتلا پایا جاتا ہے۔ جو اگر بر وقت ذرا سی توجہ کی جاتی تو بچا لیا جا سکتا تھا۔

تعلیم کے دو طریقے بیک وقت رائج ہیں۔ ایک طریقہ معدودے چند دولت مند بچوں کے لئے دوسرا عوام الناس کے بچوں کے لئے۔ چنانچہ ۱۹۳۸ء میں ۵ سے ۱۴ برس کی عمر کے پچاس لاکھ سے کچھ ہی زیادہ بچے ابتدائی اور ثانوی مدارس میں شریک تھے جو اس عمر کی مشخصہ مجموعی آبادی کا ۹۲٫۶ فیصد جزو ہے بقیہ تین لاکھ اکانوے ہزار بچوں میں سے اکثر کی تعلیم پرائیویٹ مدارس میں ہوتی تھی۔ ان مدارس ہی سے نکل کر یہ بچے ایٹن، ہیرو، ونچسٹر وغیرہ پبلک مدارس میں شریک کئے جاتے تھے۔ یہ دو قسم کے طالب علم ایک دوسرے سے بالکل الگ رہتے ہیں۔

ملک کی حکومت پر اس دو رنگی تعلیم کا نہایت دوررس اثر محسوس ہو رہا ہے بورڈ آف ایجوکیشن ( B. E. ) بیسویں صدی کے آغاز میں قائم ہوا، اس وقت سے ۱۹۴۲ء تک صرف ایک پریذیڈنٹ آرتھر ہنڈرسن ایلیمنٹری مدرسہ کا تعلیم یافتہ سمجھا جا سکتا ہے۔ بقیہ ۱۸ میں سے کم از کم ۱۲ بڑے پبلک مدرسوں سے نکلے ہیں۔ موجودہ زمانہ کے پریذیڈنٹ تو اور بھی زیادہ بلند طبقوں کے افراد ہیں ۱۹۳۱ء سے جو سات پریذیڈنٹ گزرے ہیں ان میں سے چار ایٹن اور آکسفرڈ کے ہیں اور بقیہ تین کلفٹن ( Clifton ) اپنگھم (Uppingham)

اور مارل برو ( Marlborough ) کے۔
تعلیم کے نظم و نسق کی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ انگلستان اور ویلز کا
ایک ہی مرکزی اختیاری ( Authority ) مجاز بورڈ تعلیم ( B.E
) ہے۔ جو وائٹ حال میں حکومت کا ایک ڈپارٹمنٹ یا محکمہ ہے۔ بورڈ
بظاہر وزرائے کیبنٹ ( Cabinet ) کے چند ارکان پر مشتمل ہے
جن میں چانسلر آف دی اکسچکر اور وزیر اعظم بھی شامل ہیں لیکن بورڈ کا اجلاس
کبھی بھی منعقد نہیں ہوا۔ اس کے تجاویز اس کا پریذیڈنٹ ہی نافذ کرتا ہے اور
ان پر ارکان سیول سروس کا اثر حاوی ہے جو کبھی کسی مدرسہ کا معائنہ نہیں کرتے
اس بورڈ تعلیم کا ویلز سے متعلق ایک محکمہ ہے اور خود اس کا ایک علیحدہ
دائمی معتمد ہے۔ اس کے برعکس اسکاٹ لینڈ کا ایک جداگانہ محکمہ تعلیم ایڈنبرا
میں قائم ہے جس کا کوئی پریذیڈنٹ نہیں۔ اسکاٹ لینڈ کا سکریٹری اسٹیٹ
اس ملک کی تعلیم کے لئے حکومت کے دوسرے شعبوں کے مماثل ذمہ دار ہے
البتہ برطانیہ اور ویلز کے بورڈ تعلیم کے پریذیڈنٹ کو ماہران تعلیم کی کمیٹی کے
مشوروں سے وقتاً فوقتاً مدد ملتی رہتی ہے۔ اس کمیٹی میں خاص خاص مسائل پیش
ہوتے ہیں اور وہی اہم رپورٹیں ( مثلاً ہیڈو Hadow رپورٹ )
شائع کرتی ہے۔ ہیڈو رپورٹ کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ اصلاحی تعلیم کی علمبردار ہے
بورڈ تعلیم کے مدارس دراصل ۳۱۵ مقامی مجازوں ( L.E.A )
کے زیر ہدایت و نگرانی جاری ہیں۔ بورڈ صرف گرانٹ منظور کرتا ہے۔ منظورہ
چند برسوں میں یہ رقم مجموعی اخراجات تعلیم کے نصف سے بھی کم رہی ہے بعض
مقامی تعلیمی مجازوں ( L.E.A's ) کو دوسروں سے بہت زیادہ
گرانٹ دیجاتی ہے۔ مقامی تعلیمی مجازوں سے مراد کونٹی اور کونٹی برو

( Borough ) کی کونسلیں ہیں اور ایک سو اڑتالیس بڑو اور
بائیس اربن ڈسٹرکٹ کونسلیں ( Urban District ) ہیں۔
کونٹیاں چھوٹی بڑی ہونے کی وجہ سے اساتذہ کے مشاہرے پر بھی فی بچہ غیر مساوی
روپیہ صرف ہوتا ہے۔ تعلیمی مجازوں کا فرض ہے کہ تمام تعلیمی مسائل اپنی متعلقہ
تعلیمی کمیٹیوں میں پیش کریں۔ اس کمیٹی کا صدر افسر، ناظم تعلیم، افسر تعلیم یا معتمد
تعلیم کہلاتا ہے۔ چھوٹے شہروں میں ٹاؤن کلرک بھی صدر بنا دیا جاتا ہے۔
مدارس کے انتظام سے متعلق یہ کہنا ضروری ہے کہ اس وقت تقریباً نو ہزار
چرچ اسکول ہیں جن میں ابتدائی مدارس کے ۲۲ فیصد بچے شریک ہیں۔
۱۲۲۶ رومن کیتھولک مدارس ہیں جن میں ۷ فیصد بچے ہیں۔ ۲۹ نان کنفرمسٹ
اور ۱۳ یہودی مدارس ہیں جن کے طلبا کی مجموعی تعداد ایک فیصد سے کمتر ہے
ان اعداد شمار سے ظاہر ہے کہ کونسل کے مدارس اگرچہ عدداً جملہ مدارس کے
نصف سے بھی کم ہیں۔ ستر فی صد سے زیادہ بچے ان میں تعلیم پاتے ہیں۔ اس
بات کی اہمیت آگے چل کر واضح ہوگی۔
اس وسیلے طریقۂ تعلیم میں ان دنوں سب سے بڑی دقت روپیہ کی ہے
والنٹری یعنی خود ارادی مدارس کی مجالس انتظامی نئے امکنہ کی تعمیر یا جدید تعلیمی
طریقوں کی اجرائی کے لئے کافی روپیہ فراہم کرنے میں قاصر ہیں۔ اس لئے مختلف
مقامات کے بچوں کے تعلیمی "مواقع" ( Opportunities )
اور سہولتوں میں بہت فرق پایا جاتا ہے۔ اگر کسی طرح سے تمام مدرسے سررشتہ
تعلیم کے اختیار تمیز ( مجازوں ) کے تحت کر دیئے جائیں تو ترقی تعلیم کی راہ
میں سب سے بڑی جو رکاوٹیں محسوس ہو رہی ہیں برخاست ہو جائیں گی۔
بعض مدارس میں اساتذہ کی قلت ہے بعض میں کمروں اور ان کی گنجائش

(یعنی طول و عرض وغیرہ) کی۔ ابھی یہ مہمل خیال منتظمان تعلیم کے دماغ سے دور نہیں ہوا کہ چھوٹے بچوں کے مدارس میں اگر بچوں کی تعداد فی جماعت بہت زیادہ ہو تو کوئی قباحت نہیں۔

ابتدائی تعلیم ختم کرکے ثانوی مدارس میں معافی فیس کے ساتھ بچوں کا داخلہ اسپیشل پلیس اگزامنشن (امتحان حصول خاص مقام) کے نتیجہ کے تابع ہوتا ہے۔ اس طریقہ سے سات بچوں میں ایک بچہ ثانوی تعلیم سے استفادہ کرسکتا ہے حالانکہ ہیڈو کی مشہور رپورٹ موسوم بہ "نو بالغین کی تعلیم" (Adolescent Education of the-) جو ۱۹۲۶ء میں مجلس مشاورت کی طرف سے بورڈ تعلیم (B.E) کے سامنے پیش کی گئی تھی اس میں سفارش کی گئی ہے کہ گیارہ سال یا اس سے قریبی عمر کے تمام بچوں کو مختلف اقسام کے ثانوی مدارس میں سے کسی نہ کسی مدرسہ میں منتقل کر دیا جانا چاہیئے۔ اسی کمیٹی نے آگے چل کر ۱۹۳۸ء میں اسپنس (Spens) رپورٹ میں سفارش کی ہے کہ یہ مدارس تین قسم کے ہونے چاہئیں۔

(۱) گرامر اسکول (عالیہ ثانوی مدرسہ کے مشابہ) (۲) موڈرن یعنی جدید مدرسہ (۳) ٹکنیکل یا فنی مدرسہ۔ ان تجاویز کی تفصیلات پر بہت بحثیں کی جارہی ہیں۔ ایک متبادل تجویز جس کو ٹریڈ یونین کانگریس (T.U.C.) اور دیگر مجالس پسند کرتے ہیں۔ یہ ہے کہ ملٹی لیٹرل (ضعف پہلوئی) تمام کا ایک ہی ثانوی مدرسہ قائم کیا جائے جس میں مختلف قابلیتوں اور رجحانات و مقاصد کے بچوں کی مناسبت سے تعلیمی نصاب رائج ہوں۔ ان تمام تجاویز میں اصرار کیا گیا ہے کہ صرف بچہ کی تعلیمی حالت کا لحاظ کیا جائے۔ والدین کی مالی حالت و اثر وغیرہ کا امتیاز نہ ہو۔ بورڈ تعلیم کے شائع کردہ پمفلٹ بعنوان "تعلیم کا نیا منظر"

(The New Prospect in Education )
میں ہیڈو رپورٹ کا ہی نشاء بتایا گیا ہے۔

۱۹۰۷ء میں فری پلیس (مفت بلا فیس) تعلیم کا طریقہ رائج کیا گیا۔ بورڈ تعلیم کی ثانوی مدارس کی گرانٹ اس شرط کے ساتھ منظور کی گئی کہ کم از کم ۲۵ فیصد بچوں کو مفت تعلیم دی جائے اور اسکالرشپ کی تعداد میں بتدریج اضافہ کیا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں ایک کمیٹی منعقد کی گئی جس نے سفارش کی کہ ۲۵ کے بجائے ۴۰ فیصد بچوں کی تعلیم مفت ہو اور بالآخر فیس تعلیم بالکلیہ موقوف کر دی جائے اسی طرح فی ہزار کی آبادی میں سے بیس بچوں کو ثانوی مدارس میں شریک کر لیا جائے۔

لیکن ۱۹۳۲ء میں I. E. A مجبور ہو گئے کہ بجائے فری پلیس کے طریقہ کے مینز ٹسٹ کے ذریعہ ( Means Test ) یعنے والدین کی آمدنی کا پتہ چلا کر حسب ضرورت بلحاظ آمدنی پوری یا جزوی فیس وصول کیجائے ساتھ ہی فیس تعلیم میں اضافہ کیا گیا جو عموماً سالانہ ۱۵ پونڈ اور اعلاً نو پونڈ ہے۔ طالب علم کو جب اسپیشل پلیس (خاص مقام) عطا ہوتا ہے تو اس کے والدین کو اپنی آمدنی، کرایہ مکان اور بچوں کی تعداد وغیرہ بتا دینا ہوتا ہے۔ اس کے لحاظ سے فیس کلاً یا جزواً معاف کیجاتی ہے۔ بعض صورتوں میں اخراجات خورد و نوش سفر اور خریدی کتب کے لئے امداد جاری کیجاتی ہے۔ ثانوی مدارس کی تفصیل بہت پیچیدہ ہے۔ یہاں اس میں جانے کی ضرورت نہیں۔

اب پرائیویٹ اور نام نہاد پبلک مدارس کا مختصر خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔ نام نہاد اس لئے کہ ان مدارس میں پبلک (یعنے عوام الناس) کا کوئی بچہ داخل نہیں ہو سکتا۔ متمول لوگ ہی اپنے بچے بھیج سکتے ہیں۔ ان کی دو یا تین قسمیں ہیں ہے

وقتاً فوقتاً بورڈ تعلیم مسلمہ ثانوی مدارس کی ایک فہرست (نمبر ۶۰) شائع کرتا ہے جس میں
براہ راست یا بالواسطہ امدادی گرانٹ حاصل کرنے والے مدرسوں کے نام
شریک ہوتے ہیں (جن کا قبل ازیں ذکر آچکا ہے)۔ ان کے علاوہ کوئی ۵۰ ۷
خود مختار مدارس (بشمول ۳۵۰ پریپریٹری یعنی داخلے کے لئے تیار کرنے والے
اسکول) بھی ان میں شامل ہوتے ہیں جن کی طرف سے معائنہ (انسپکشن) کی
درخواست پیش ہوتی ہے اور جو بعد معائنہ اگر مناسب تصور ہوں تو تسلیم کر لئے
جاتے ہیں۔ ان میں بہت سے مشہور پبلک اسکول جیسے ایٹن، ہیرو وغیرہ اور کویکر
( Quaker ) مدارس اور بعض پرائیویٹ مدارس مثل بڈ ملیز
( Bedales ) بھی ہیں۔ پبلک اسکول اس زمانہ سے قائم ہیں
جب کہ حکومت کی جانب سے تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا یہ مدارس عموماً وقف
کی مدد سے جاری تھے۔ ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں جب انگلستان کا متوسط طبقہ
بہت متمول ہو گیا تو اس طبقہ کے بچوں کی تعلیم کے لئے یہ مدرسے ایک طرح سے
مخصوص ہو گئے۔

۱۸۶۱ء کی پبلک اسکولوں کی انکوائری کمیٹی (مجلس تحقیقات) کی رپورٹ
صرف نو مدرسوں ہی تک محدود تھی۔ جوں جوں اساتذہ یا طلبہ کی قابلیت کا چرچا
ہوتا گیا دوسرے مدارس بھی اس زمرہ میں شامل کئے جانے لگے۔ ان دنوں پبلک
اسکول سے مراد صرف ایسا مدرسہ ہے جس کا صدر مدرس کانفرنس صدر مدرسین
کی دعوت پر کانفرنس کا رکن منتخب ہوتا ہے۔ دعوت کے شرائط یہ ہیں کہ مدرسہ
ایک معینہ وسعت و تعداد طلبہ کا ہو۔ خود مختار ہو اور اس کے سابق طلباء کی
ایک معینہ تعداد آکسفرڈ و کیمبرج کی جامعات میں شریک ہو۔ اس فہرست میں ۱۷۱
مدرسے انگلستان اور ویلز کے ہیں اور ۸ اسکاٹلینڈ کے۔ مگر ان میں سے کم از کم

[illegible] کو گرانٹ ملتی ہے اور اکثر بڑے اسکول (یعنے صرف دن کی پڑھائی کے) ہیں
برطانیہ کے دیگر اقسام کے مدارس کی تفصیل وسیع اور پیچیدہ ہے ہمیں اس تفصیل
میں جانے کی ضرورت نہیں۔

ان تمام مدارس پر امتحانوں کا اثر حاوی ہے۔ تمام مسلمہ ثانوی مدارس اور متعدد
دوسری قسم کے مدارس کا مطمح نظر یہ ہے کہ کسی جامعہ یا دگر وہ جامعات کے اسکول
سرٹیفکیٹ کے امتحان کے لئے ۱۵ یا ۱۶ برس کی عمر کے طلبا کو تیار کیا جائے! ان میں
کامیابی حاصل ہو تو جامعہ کے داخلہ (انٹرنس) کے امتحان سے مستثنیٰ ہو جاتے ہیں۔ ہر
سال تقریباً ستر ہزار امیدوار ان امتحانوں میں شریک ہوتے ہیں اور کوئی بہتر فیصد
کامیاب ہوتے ہیں۔ جامعات میں داخلہ کا خیال اسکول سرٹیفکیٹ کے طریقہ تعلیم اور
نصاب کو اکثر ضروری تعلیم کے ابتدائی مقاصد سے ہٹا رہا ہے جس کی اصلاح
ہونی چاہیئے۔ اسکول سرٹیفکیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد لڑکا یا لڑکی) چھٹی فارم
(جماعت) میں داخل کیا جاتا ہے۔ یہاں خاص خاص مضامین پر زیادہ زور دیا
جاتا ہے۔ بیس فیصد سے کم تر طلبا دو سال کی تیاری کے بعد ہائر (اعلےٰ) اسکول
سرٹیفکیٹ کا امتحان پاس کرتے ہیں جو جامعات کے پہلے سال کی تعلیم کے مماثل ہے
بعض مزید ایک سال یہاں پڑھ کر جامعہ کے اسکالرشپ کے امتحان میں کافی اچھا
درجہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بقیہ امیدوار ۱۸ سال کی عمر میں کسی ٹریننگ
کالج میں یا کسی دھندے یا صنعت میں شریک ہو جاتے ہیں۔ سکنڈری اسکولوں
کے امتحانوں کی کونسل ان امتحانوں کے متعلق بورڈ تعلیم کو مشورہ دیتی رہتی ہے۔

ثانوی مدارس چھوڑنے کے بعد سولہ میں سے ایک لڑکا اور بارہ میں سے ایک
لڑکی کسی جامعہ یا ٹریننگ کالج میں داخل ہوتے ہیں جس کے لئے مختلف ذرائع سے
وظیفے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ آکسفرڈ اور کیمبرج کی جامعات میں شرکت کے لئے

کھلے وظائف ( Open Scholarship ) یا اگزیبیشن (Exhibitions)
عطا ہوتے ہیں۔ پہلے یہ وظائف زیادہ تر پبلک اسکول ہی کے بچوں کو ملا کرتے تھے
اب ثانوی مدارس کے عام بچوں کو ان کے حصول میں کامیابی ہو رہی ہے۔ بعض مدارس
کے اوقاف میں ان وظائف کے لئے گنجائش شامل رہتی ہے۔ مجاز ان تعلیم (
(E.A's سے بھی مختلف مقدار میں امداد مل سکتی ہے۔ حساب لگایا گیا ہے کہ
ان مجازوں نے ۱۹۳۸ء میں تقریباً ۸ ہزار کی (جو تعداد کے ساتھ انگلستان اور ویلز
کی جامعات میں زیر تعلیم طلبار کی تعداد کے ایک تہائی سے کچھ ہی کم تھی) اس طرح مدد
کی تھی۔ ان وظائف کے علاوہ اسٹیٹ ( State ) کے وظائف بھی
جو ۱۹۲۰ء میں قائم کئے گئے۔ اب ان کی تعداد سالانہ ۳۶۰ ہے۔ وہ ہائیر اسکول
سرٹیفکیٹ کے امتحان کے نتیجہ پر عطا ہوتے ہیں۔ ان تمام ذرائع سے ۱۹۳۸ء میں
جامعات انگلستان و ویلز میں ۵۴۷۵ (بقدر ۲ ہزار ۵ سو) وظیفہ یاب طالب
زیر تعلیم تھے۔ ان سہولتوں کے باوجود اسکول سرٹیفکیٹ کا کورس ختم کرنے سے
پہلے سولہ سال کی عمر کو پہنچنے سے قبل ہی طلبار کا چوتھائی حصہ مدرسہ ترک کر دیتا ہے
حالانکہ اجرائی وظیفہ کے وقت وعدہ کیا جاتا ہے کہ ایسا نہیں کیا جائے گا۔
اس سے نہ صرف تعلیم کے حقیقی شائق اور مستحق طلبار کو نقصان پہنچتا ہے بلکہ خود ان
طلبار کو بھی جو قبل از وقت مدرسہ چھوڑ دیتے ہیں عموماً اچھی ملازمتیں ملنا مشکل
پیش کیا جاتا ہے جو مستعد ہے۔ افسوس ہے کہ ان دنوں چودہ سال کی عمر میں مدرسہ
ترک کرنے کا رواج عام ہو رہا ہے۔ جونیر ٹکنیکل اسکولوں کے قیام سے فنی تعلیم
کی طرف رغبت بڑھ رہی ہے۔ ۱۳ سال کی عمر میں لڑکے اور لڑکیاں ان مدارس
میں شریک ہو کر فنون اور پیشوں کے مبادیات سے واقفیت حاصل کر لیتے ہیں۔
لڑکے عموماً مضامین انجینئرنگ و تعمیرات کی تعلیم پاتے ہیں اور لڑکیاں تجارت (کامرس)

کی آ ایسے متعلمین کی تعداد تقریباً ۲۸ ہزار ہے جن میں ۶۰ فیصد لڑکیاں ہیں۔ ان امور کو پیش نظر رکھ کر اسپنس ( Spens ) کی رپورٹ میں ٹیکنیکل ہائی اسکولوں کے قیام کی تجویز پیش کی گئی جو ابھی صفحہ قرطاس سے آگے نہیں بڑھی۔

معاشی پستی کے دور میں ۱۴ برس اور اس سے زائد عمر کے نوجوانوں کی بیکاری اور پھر جنگ کی عام پراگندگیوں سے متاثر ہو کر بورڈ تعلیم نے نیشنل یوتھ کمیٹیاں (National Youth Committees) قائم کیں اور ۱۴ سے بیس برس کی عمر والے نوجوانوں کے معاشری (نہ کہ حقیقی تعلیمی) ضروریات پورا کرنے کی خاطر بڑی بڑی رقمیں مہیا کی ہیں۔ ان حالات کے تحت تعلیم بالغان کی اہمیت و ضرورت شدت کے ساتھ محسوس ہوئی۔ اس نوع کی تعلیم کے اداروں کی دو قسمیں قائم کی گئیں۔ شام کے تعلیمی اداروں اور کالجوں میں عام تعلیم پانے والوں کی تعداد ۵ لاکھ تک ہو گئی ہے اکثر تو ان میں سے پیشہ وری کی ( Vocational ) تعلیم پاتے ہیں۔ بقیہ غیر پیشہ وری مثل السنہ موسیقی وغیرہ کی تعلیم بالغان کا مفہوم عموماً ایسے طلبار کی تعلیم سے وابستہ ہے جو ورکرز ایجوکیشنل ایسوسی ایشن ( W. E. A ) ایسے عمال کی تعلیمی انجمن کی قائم کردہ تین ہزار جماعتوں میں سے کسی ایک میں شریک ہیں۔ جو ایک طرف جامعات کے، دوسری طرف ٹریڈ یونین اور بورڈ تعلیم سے گرانٹ حاصل کرنے والی عمالی جماعتوں کے اشتراک عمل سے جاری ہوئی ہیں۔ ان طلبار کا مطمح نظر کوئی سند یا ڈپلوما حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ معاشری زندگی کے فوائد معلوم کر کے ان سے استفادہ کرنا ہے۔ بعض منتخب طلبار اقامتی کالجوں میں شریک ہو جاتے ہیں جہاں دو سال کے لئے اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کی ایک مثال آکسفرڈ کا رسکن ( Ruskin ) کالج ہے۔ جس کی مجلس انتظامی میں عمالی طبقہ کے نمائندے بشمول ( W.E.A., T.U.C. ) شریک ہیں۔

اب جامعاتی تعلیم کی نسبت کچھ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ بورڈ تعلیم کو سوائے چند وظائف تعلیمی و خاص قسم کی گرانٹس عطا کرنے کے اس نوع کی تعلیم سے کوئی تعلق نہیں ہے (L. E. A) مقامی تعلیمی مجاز بھی اس تعلیم کے لئے امدادی گرانٹ منظور کر سکتے اور یونیورسٹی کے کورٹ میں نمائندے بھیج سکتے ہیں اور بس۔ انگلستان کی جامعات بخلاف دیگر ممالک کی جامعات کے خود مختار ادارے ہیں۔ رائل چارٹر (شاہی سند) کی بدولت وہ اپنے کاروبار آپ خود انجام دے لیتے ہیں ان کو خزانہ سرکار سے بتوسط یونیورسٹی گرنٹیس کمیٹی رقمی امداد ملتی ہے جس کا پریزیڈنٹ کوئی سربرآوردہ وائس چانسلر (معین امیر جامعہ) ہوتا ہے۔ بورڈ تعلیم سے اسکو کوئی تعلق نہیں۔ حالیہ جنگ سے پہلے انگلستان اور ویلز کی جامعات میں کوئی چالیس ہزار افراد تعلیم پاتے تھے۔ انگلستان میں دس جامعات اور پانچ یونیورسٹی کالج ہیں۔ یونیورسٹی کالج بذات خود کوئی ڈگری نہیں عطا کر سکتے۔ ان کے طالب علم جامعہ لندن کی اکسٹرنل ڈگری حاصل کر سکتے ہیں (Wales) ویلز میں ایک جامعہ ہے جس کے تحت بنگور (Bangor) کارڈف (Cardiff) سوانسی (Swansea) اور ابیرسٹ وتھ (Aberystwyth) کے کالج ہیں۔

انگلستان میں اساتذہ کی تربیت (Training) کے بھی دو طریقے مروج ہیں۔ ایک طریقہ تو خود ارادی (Valuntary) ٹریننگ کالجوں کا ہے جو زیادہ تر چرچ (Church) کے کالج ہیں اور چند L.E.A's کے۔ دوسرا طریقہ جامعات کا ہے۔ ٹریننگ کالج خود مختار ادارے ہیں جہاں مردوں یا عورتوں کو ۱۸ یا ۱۹ برس کی عمر میں داخل کر کے دو سال کی تربیت دی جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ معلمی کے سرٹیفکٹ کا امتحان دیتے ہیں جو ریجنل بورڈ

(Regional Boards) اور جامعات کے اشتراک عمل سے لیا جاتا ہے۔
دوران تربیت طلباء کو معمولی مدارس کے مضامین سکھائے جاتے ہیں لیکن اس
نقطۂ نظر سے کہ تربیت پانے والے آگے چل کر مدارس کے بچوں کے استاد بنیں گے۔
ان کے علاوہ بعض نئے مضامین مثلاً نفسیات سے بھی ان کو واقف کرا دیا جاتا ہے۔
نصاب میں چند اسکول پریکٹس بھی شامل ہے۔ یعنی قریب کے کسی مدرسہ میں کالج کے
اساتذہ کی نگرانی میں استادی کے امیدوار کو بچوں کو پڑھانا بھی پڑتا ہے۔ اس
عملی تربیت کی خوبی میں کلام نہیں لیکن اس کی محدود معاشری چاردیواری قابل
اعتراض ہے۔

جامعہ کے ٹریننگ ڈپارٹمنٹ میں معاشری صورت حال تو ٹھیک ہے لیکن
ہونے والے استادوں کی عملی تربیت ناکافی سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے کہ جامعہ کی
ڈگری حاصل کرنے کے بعد صرف ایک سال ہی کی تربیت پر تعلیم کا ڈپلوما Dip. Ed.
دیا جاتا ہے۔ اور اس قلیل مدت میں سے بھی ایک معقول امیدوار کو بہ حیثیت پیوپل ٹیچر
(متعلم مدرس) کسی ثانوی مدرسے میں درس دینا پڑتا ہے۔ معہذا اس کو جامعہ میں ثانوی
مدارس ہی کی تعلیم پر توجہ کرنی پڑتی ہے۔ حالانکہ اساتذہ کی ایک کثیر تعداد ان دنوں سینیر
ایلیمنٹری مدارس کی تدریس پر متعین کی جاتی ہے۔

اسکاٹلینڈ کا سررشتۂ تعلیم بورڈ تعلیم سے بالکل غیر متعلق ہے ۱۹۲۹ء سے اس ملک
میں T. E. A ۳۱ کونٹی کونسلوں اور چار قدیم برگز (Burghs)
ایڈنبرا گلاسگو، ابارڈین، اور ڈنڈی پر مشتمل ہیں ۱۹۱۸ء سے ترک مدرسہ کی عمر شل
انگلستان کے بچوں کے ۱۴ سال قرار دی گئی ہے مگر ۱۲ برس کی عمر کے بچوں کو اپنے
گھروں پر کام کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ یہاں طریقۂ تعلیم عمومی (Democratic)
اصول پر قائم ہے۔ غریب امیر کے بچوں کی تعلیم میں

فرق نہیں ہے۔ سنہ ۱۹۲۹ کے نئے قانون ( code ) سے اس ملک کے
تمام مدارس حکومت کے تحت کر دیئے گئے ہیں۔ معہذا پیشہ معلمی کی تعلیم و تربیت
سکاچوں کے لئے ایک ہی طریقہ ہے۔ اکثر استاد اور استانیاں بڑی تعداد میں جامعات
میں تربیت پاکر ڈگری حاصل کرتے ہیں۔ ان کے مشاہرے ایلیمنٹری یا سکنڈری
مدارس کے امتیاز سے بری ہیں۔ تمام اساتذہ ایک واحد ادارہ (ایجوکیشنل انسٹیٹیوٹ
آف اسکاٹلینڈ) کے ارکان ہیں، جس میں بہت سارے جامعات کے استاد بھی
شریک ہیں۔

وہاں چرچ کا سوال اب باقی نہیں رہا۔ اس کے چرچ اسکول (جو واضح ہے کہ
زیادہ تو چرچ آف اسکاٹلینڈ کے مدارس ہیں) جن کی تاریخ سنہ ۱۶۹۶ سے چلی آرہی ہے
سنہ ۱۸۷۲ کے ایکٹ ( Act ) سے اسٹیٹ کے تحت منتقل کر دیئے گئے
اور فری چرچ ( Free Church ) کے مدارس کے ساتھ بھی یہ عمل کیا گیا۔
سنہ ۱۹۱۸ میں خود امدادی مدارس کی گرانٹس مسدود کر دی گئیں۔

بریں ہمہ اسکاٹلینڈ خود اپنے ذاتی تعلیمی مسائل سے بالکلیہ بے نیاز نہیں ہے
لیکن وہ اتنے پیچیدہ نہیں جیسے انگلستان کے ہیں۔ اس کی چار جامعات ایڈنبرا،
گلاسگو، سینٹ اینڈ روز اور ابارڈین اقامتی نہیں ہیں۔ سستے کرایہ کے کمروں اور
کفایت شعاری کی زندگی کی وجہ سے، اور دور حاضر میں کارنیجی ( Carnegie
Andrew سنہ ۱۸۳۵ - ۱۹۱۹) کے وقف کی مدد سے ملک کے اندر جامعاتی تعلیم
دور دور تک سرایت کر گئی ہے۔ تقریباً دو متنفس فی ہزار اس سے استفادہ کرتے
ہیں (جو انگلستان اور ویلز کے مقابلہ میں دو چند ہے)

ویلز کی تعلیم کا طریقہ عام طور پر انگلستان ہی کا سا ہے۔ مگر قومیت کے اصول
حاوی ہیں۔ چنانچہ ثانوی تعلیم پانے والے بچوں کی تعداد فی ہزار آبادی ۱۴ و ۱۸

(انگلستان میں صرف (۱۱) یہاں ادائی فیس سے مستثنیٰ ۶، ۶۵ فیصد ہیں - اور انگلستان میں ۴۵ -

انگلستان میں اس وقت چند تعلیمی تجربے (Educational Experi-ments) بھی جاری ہیں - شیرخواروں (Infants) کے لئے مونٹیسوری (Montessori) کا طریقہ اور مارگریٹ میکملین (Margaret Macmillan) کے نرسری اسکول کا اثر تعلیم کے دوسرے شعبوں پر بھی مفید ثابت ہو سکتا ہے - ہیڈو (Hadow) کمیٹی نے جدید انفنٹ اسکول کو تعلیم کا مقام نہیں بلکہ تعلیم کا ماحول (Environment and Experience) قرار دیا ہے - یہاں نصاب کا تصور عمل اور تجربہ (Activity) کی رقموں میں کیا جاتا ہے نہ کہ کتابی معلومات کی رقموں میں -

اسی تصور کے تحت کیمبرج شائر (Cambridgeshire) میں سینیر اسکول کھولے گئے ہیں اور دیہاتی کالج بھی یہاں دیہات کے لوگوں کو ان کے ماحول ہی کے اثر کے تحت لیبرل (Liberal) تعلیم دی جاتی ہے

ڈالٹن پلین (Dalton Plan) کا اصول مختصراً یہ ہے کہ طالب علم کو جس کسی مضمون سے خاص دلچسپی ہو اسی سے متعلق ہفتہ یا مہینہ بھر کا کام اس کے تفویض کر دیا جاتا ہے - وقت نامہ کے قیود سے آزاد ہو کر طالب علم اپنا کام کئے جاتے ہیں۔

اے - ایس - نائیل (A. S. Neill) کی تحریرات سے پتہ چلتا ہے کہ بعض پرائیویٹ مدارس میں اسی قسم کے تجربے جاری ہیں - ان تجربوں میں زیادہ تر طالب علم کے اظہار خودی (Self Expression) تادیب خودی (Self-Government) اور کامل آزادی کی تائید کی جاتی ہے -

# نئی معاشرت کیلئے راستہ

---

افلاطون نے چوتھی صدی قبل مسیح سے بھی پہلے تعلیم کا مقصد کردار کی درستی بتایا تھا لیکن لوگ اس سے مادّی دنیا کو جو فائدہ پہنچ سکتا ہے اسی کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں تعلیم کے فلسفہ کے متعلق جو بھی قیاس آرائی ہو اقتصادی ضروریات کی بجاآوری کیلئے تعلیم کے استعمال کا کوئی مخالف نہیں۔ بلکہ جس قدر صنعتی خوش حالی تعلیم سے رونما ہوتی ہے۔ اسی قدر زیادہ اس کی کامیابی سمجھی جاتی ہے۔ لیکن اس کے متضاد تصور پر یعنی صنعت کے فرائض میں خود تعلیم کی خدمت داخل ہونی چاہئے بہت کم لوگ متفق نظر آتے ہیں

ڈاکٹر آر۔ ایچ۔ ٹانی (R. H. Tawney) نے اپنی کتاب "تحصیلی معاشرت" (The Acquisitive Society) میں صاف کہہ دیا ہے کہ صنعت و حرفت کا معاشری مقصد ہی اس کے قیام و ترقی کی اجازت دیتا ہے۔ انگلستان کا یہ طریقہ عمل خلاف عقل ہے کہ عوام الناس کے بچوں کی تعلیم کو روک کر صنعت و حرفت کو فروغ دیا جاتا ہے۔

جینوا (Geneva) کے بین الاقوامی عمالی دفتر (International Labour Office) کے دروازوں پر جو تحریر "معاشری انصاف بغیر امن ناممکن" ثبت ہے، ایک اہم پیشین گوئی بھی ہے اور مخالفین کے لئے تنبیہہ بھی۔ پریزیڈنٹ روزولٹ نے نومبر ۱۹۴۱ء کی بین الاقوامی عمالی کانفرنس میں اپنے اڈریس میں اس بنیادی اصول پر زور دیا ہے کہ "حالیہ جنگ کے بعد دنیا میں نہ تو افراد کے لئے اور نہ اقوام کے لئے خاص رعایات کا کوئی موقع ہونا چاہئے۔" اگر تنظیم مابعد جنگ کے کارپرداز اس اصول پر خلوص کے ساتھ عمل کریں تو معاشری دنیا میں انقلاب ہو جائے گا اور

سبھوں کے لئے تعلیم کے مساوی مواقع مہیا کئے جا کر مساوی اقتصادی مواقع بھی حاصل ہو سکیں گے۔ موجودہ دنیا میں ہوتا یہ ہے کہ اقتصادی رعایات کی مدد سے تعلیمی مفاد خریدا جاتا ہے۔ اور تعلیمی مفاد سے اقتصادی رعایات پر قبضہ برقرار رکھا جاتا ہے کسی کو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اچھے تعلیم یافتہ اشخاص ہی کو بہترین خدمات و انعامات عطا ہوں۔ لیکن سبھوں کو تعلیم سے مساوی فائدہ اٹھانے کے مواقع نہ دینا بعید از انصاف ہے۔

افسوس ہے کہ انیسویں صدی کے نہ صرف برطانوی سیاسی بلکہ مذہبی نمائندے بھی عموماً اس ناانصافی کے حامی رہے ہیں۔ افلاطون نے صدیوں قبل مشورہ دیا تھا کہ اسٹیٹ کے محافظ ملک کے "اعلیٰ" طبقہ سے منتخب ہونے چاہئیں۔ ورنہ محافظ خود ملک کی حفاظت کے بجائے اس کو لوٹ کر کھا جائیں گے۔ یہاں اعلیٰ طبقہ سے مراد مال و دولت میں اعلیٰ نہیں بلکہ اخلاق و کردار میں اعلیٰ طبقہ مراد ہے۔ (جو کسی خاص خاندان یا کلاس تک محدود نہیں) صرف تعلیم کا انتظام مہیا کر دینا کافی نہیں۔ یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ اس انتظام سے آیا سب لوگ مساوی طور پر استفادہ کر سکتے ہیں یا نہیں۔ برطانیہ میں چوٹی کی خدمتوں پر جو لوگ حکومت کی باگ تھامے ہوئے ہیں وہ زیادہ تر دولتمند طبقہ کے پبلک اسکولوں کے پڑھے ہوئے ہیں۔ اگرچہ ان کی عام قابلیت اور کام کے اہل ہونے کی نسبت کسی کو شبہ نہیں تاہم پبلک اسکول کی تعلیم کا مفاد ایک خاص طبقہ ہی کے لئے محفوظ رکھنا عمومیت کے اصول کے خلاف ہے۔

حکومت کے خواہ داخلی امور ہوں یا خارجی ان سب پر پبلک اسکول کے تعلیم یافتہ سیول سرونٹس کا اثر چھایا ہوا ہے۔ دنیا کا امن سفراء دربار و ارکان ڈپلومیٹک سروس کے ہاتھوں میں چلا آ رہا ہے۔ ان ہی لوگوں کے مشوروں سے جنگ کا اعلان کیا جاتا ہے۔ گو لڑتے اور جان و مال کھوتے تو زیادہ

تو عوام الناس ہی ہیں جنسے اعلان جنگ کے وقت کبھی بھی براہ راست مشورہ نہیں طلب کیا جاتا ہے ۔ (ان میں تعلیم کا فقدان ان کو مشورہ دینے کا اہل بھی نہیں بنا سکتا)۔

مسٹر ہیرلڈ بٹلر (Harold Butler) سابق ڈائرکٹر انٹرنیشنل لیبر آفس نے اپنی جدید کتاب The Lost Peace (کھویا ہوا امن) میں لکھا ہے کہ کسی ملک کی حقیقی اہمیت اور خصوصیات کے حامل اس کے سیاسی نہیں ہوتے ہیں ۔ ملک کے نازک (فنا و بقا) کے موقعوں پر ملک کی سچی نمائندگی ان سے نہیں ہوتی بلکہ عوام الناس سے ہوتی ہے ۔ اس لئے ضروری ہے کہ ملک کی حقیقی حالت اور اس کے رجحانات دریافت کرنے کے لئے اس کے عوام الناس کی ذہنیت و جذبات تک رسائی پیدا کی جائے ۔

یورپ اب چرچ کی گرفت سے تو نکل گیا لیکن دنیا پر قومیت کا بھوت سوار ہو گیا ہے ۔ اور آئے دن کشت و خون پھیلا رہا ہے ۔ تاریخ کی کتابیں خواہ دانستہ یا نادانستہ طریقوں سے آنے والی نسلوں کو جنگ کی ترغیب دلاتی چلی آ رہی ہیں ۔ بین الاقوامی صلح و امن عوام کی مساوی ترقی و خوش حالی ہی سے حاصل ہو سکتے ہیں ۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ عوام الناس کو کافی اخلاقی معاشی و معاشرتی تعلیم دلائی جائے تاکہ اقوام کے دلوں سے رعونت اور جھوٹا احساس برتری دور ہو اور لوگ آمریت کے پنجوں میں گرفتار نہ ہوں ۔ رواداری اور اشتراک عمل کے ذریعہ بین الاقوامی مسائل حل کرنے کی کوشش کریں ۔ یہہ کام مدرسوں ہی کے ذریعہ جب کہ پڑھنے والوں کے دل کم سنی کی وجہ سے بھکانے والے خیالات سے مبرا اور پاکیزہ خیالات کے قبول کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں، بخوبی انجام پا سکتا ہے ۔ ریڈیو اور سنیما کے ذریعہ بھی اس کام میں

مدد لی جاسکتی ہے۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ موجودہ دنیا میں ریڈیو اور سنیما کبھی کچھ اچھے کام کرتے ہیں تو ان سے کہیں زیادہ قبیح کاموں کے محرک ہوتے ہیں۔ اس کی اصلاح کیجانی چاہیئے۔

ڈیموکریسی (عمومیہ) کو صرف اسی وقت کامیابی حاصل ہوسکتی ہے جبکہ تعلیم عام ہو اور اس کا مطمح نظر محض مادی مفاد نہ ہو بلکہ اخلاقی و معاشری بھی ہو۔ حقیقی اسلامی تہذیب اسی لئے صحیح مذہبی تعلیم پر قائم کی گئی ہے تاکہ ایمان کی درستی کے ساتھ معاشرت قائم ہو۔ اور بنی نوع انسان رواداری اور اشتراک عمل کی زندگی بسر کرے۔ فقط۔

---
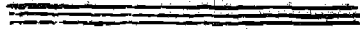
# ہندوستان میں جنگ کے بعد کی تعلیم المعلمین
# بعض مسائل

ہر زمانہ میں ہر ملک اور قوم نے اپنی ضروریات کی تکمیل کے راست اور بالواسطہ ذریعوں میں تعلیم کو ایک نہایت ہی اہم اور موثر ذریعہ قرار دیا اور اپنے حالات موجودہ اور توقعات مستقبل کے تحت تعلیم کے لوازمات میں نظری اور عملی طور پر ترمیم اور تبدیل کیا۔ گو اس کے زمانہ میں تعلیم کی ترقی اور اصلاح اس نوعیت کی بالعموم رہی کہ تعلیم کے مستقبل اور مستحکم کام کی اہمیت اور افادیت کو پوری طرح محسوس نہیں کیا گیا لیکن اسی زمانہ میں تعلیم کی تعمیری خدمات کا تسلسل اور سود مندی برابر جاری رہی۔ ہر جنگ کے بعد تعلیم کے مفوضہ کام میں اضافہ اور اس کی ذمہ داریوں میں زیادتی ہوتی رہی اور جس قدر زیادہ تخریبی نتائج کسی جنگ کے رہے بطور رد عملی کے اسی قدر زیادہ مابعد جنگ کی تعلیم میں تعمیری میلانات کو اہمیت دی گئی اور اصلاح اور ترقی کے مقاصد کو نمایاں طور پر پیش کیا گیا اس کا ثبوت گزشتہ عالمی جنگ سے ملتا ہے جس کا دائرہ اثر اور تخریبی نتائج اتنے زیادہ وسیع اور شدید رہے کہ اس کے اختتام پر جو تعلیمی اسکیمات تیار کی گئیں وہ بھی نہایت ہی وسیع اور بالخصوص کثیر تعمیری عناصر پر مشتمل ہیں۔

ہندوستان کی جدید تعلیمی اسکیمات بھی ان ہی خصوصیات کی حامل ہیں اور خاص طور پر سارجنٹ اسکیم۔ جو ۱۹۴۴ء برطانوی ہند کے لئے شائع ہوئی۔ اس اسکیم میں معلمین کی تعلیم سے متعلق جن خیالات اور تجاویز کو پیش کیا گیا انہیں دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک وہ جو معلمین کی تعلیم کی توسیع سے متعلق ہے اور دوسرا وہ جو ان کی تعلیم کی اصلاح سے

تعلق رکھتا ہے۔ ہندوستان کے معلمین کی آئندہ تعلیم کے دراصل یہی دو بڑے جز ہیں۔ جن کے تحت حالات وضروریات حاضرہ و مستقبل کی مناسبت سے ترمیمی اور تعمیری تجاویز کو روبہ عمل لانا ہوگا۔

ہندوستان جیسے تعلیم میں پس افتادہ ملک کے لئے یہ ضروری ہے کہ عام یا عوام کی تعلیمی توسیع کے ذریعہ ناخواندگی کو دور کرتے ہوئے جہالت کی تاریکی کے قلع قمع سے عوام کو آرام اور آسایش کی زندگی بسر کرنے کے مواقع فراہم کرے۔ اس مقصد کی تحصیل کے سلسلہ میں معلمین کی تعلیم کے وسیع انتظامات کو نافذ کرنے کی جو تحریک سارجنٹ اسکیم میں پیش کی گئی ہے گویا اس سے ہندوستان کی ایک اہم ضرورت کی تکمیل مقصود ہے اس تحریک کا منشا یہ ہے کہ ۳۵ سال کے عرصہ میں، شروع میں آہستہ اور آخری حصہ میں زیادہ تیزی کے ساتھ ۲۲ لاکھ سے زیادہ معلمین کی ٹریننگ کا انتظام کیا جائے۔ ٹریننگ میں اس مقصد کے تحت جو توسیع ہوگی اس کا ایک سرسری اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ مدت مذکورہ میں ۱۹۴۳ء میں ٹرینڈ معلمین کی جو تعداد تھی اس کا تقریباً ۲ گنا اضافہ اور ۱۹۴۱ء میں ٹرینڈ معلمین کی تعداد کا تقریباً ۲ گنا اضافہ مقصود ہے۔ برطانوی ہند کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں بھی اسکیمات تیار کی گئی ہیں جن میں معلمین کی وسیع پیمانہ پر ٹریننگ کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ان سب اسکیمات کو روبہ عمل لانے سے معلمین کی "کثیر فوج" تیار کی جاسکے گی۔

معلمین کی اس بڑی تعداد کی تعلیم کے لئے کثیر تعداد میں ادارہ جات ٹریننگ کا قیام ضروری ہے۔ چنانچہ سارجنٹ اسکیم کے حوالہ سے اگر ہر ادارہ میں ۲۵۰ طلبا یا معلمین زیر تعلیم کی تعداد مقرر کی جائے تو ۳۵ تا ۴۰ سال کے عرصہ میں صرف برطانوی ہند کیلئے ۹ ہزار ادارہ جات ٹریننگ قائم کرنا ہوگا۔ یا اگر اسی تعداد کو کم سے کم بھی کیا جائے تو ۱۹۴۱ء میں جو جملہ ادارے تھے ان کا دس گنا اضافہ یعنی ۲ ہزار سے زیادہ اداروں کا قیام عمل میں لایا جانا چاہیئے۔ مالی اور معاشی دشواریوں و نیز جنگ کے بعد کی دوسری

اسکیمات کے نفاذ کے مدنظر آیا مذکورہ صدر کثیر تعداد میں ادارہ جات ٹریننگ قائم کیے
جاسکیں گے یا نہیں گو ایک اہم سوال ہے لیکن ہمارے لئے اس سے بھی زیادہ اہم مسئلہ
معلمین کی ٹریننگ اور ادارہ جات ٹریننگ کی کارکردگی اور افادیت کو بڑھانے سے متعلق
ہے۔ چونکہ ہماری رائے میں معلمین کی ٹریننگ سے متعلق ہندوستان کی جدید تعلیمی اسکیمات
میں تعداد میں اضافہ کرنے کے مقصد کے مقابلہ میں ٹریننگ کی افادیت اور کارکردگی
کو بڑھانے کی غرض و غایت کو اہمیت دیجئے آئندہ تعلیم کی اصلاح اور ترقی کے اصلی محرکات
کے اقدار کو بڑی حد تک نظر انداز کیا گیا ہے اس لئے ہم ذیل میں خاص طور پر ٹریننگ کے متعلق
بعض امور کی اصلاح کی طرف توجہ منعطف کراتے ہیں۔

ہندوستان کی موجودہ تعلیم المعلمین کے سلسلہ میں ایک اہم مسئلہ ادارہ جات ٹریننگ
کے اساتذہ کی تعداد سے متعلق ہے یہ بیان بالعموم درست ہے کہ ایسے ادارہ جات
ٹریننگ موجود ہیں جن میں اساتذہ کی تعداد ناکافی ہے۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ
مذکورہ اساتذہ کا تقرر بڑی حد تک معلمین زیر تعلیم کی تعداد کے لحاظ سے کیا جاتا ہے۔
سارجنٹ اسکیم کی وہ تجویز جس میں ادارہ جات ٹریننگ کے اساتذہ کی تعداد کا تعین کیا گیا ہے
بڑی حد تک اسی اصول کے تحت ہے۔ اس اصول کے ترمیم کرنے کی ضرورت مختلف
وجوہ کی بنا پر محسوس کی جاتی ہے۔ مثلاً ایک وجہ یہ ہے کہ ادارہ جات ٹریننگ میں نصابی
اور بیرون درسی مضامین اور مصروفیات اتنے زیادہ ہیں کہ جن کے متعلق تعلیمی اور تدریسی کام
کو خواطر خواہ طور پر انجام دینے کے لئے نہ صرف علیحدہ علیحدہ اساتذہ کی ضرورت لاحق ہوتی
ہے بلکہ ماہرین کی بھی دوسری وجہ یہ ہے کہ ٹریننگ کے مضامین وغیرہ کی خاص نوعیت
اور اعلیٰ کام کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ اساتذہ کو کافی وقت فرصت ملے تاکہ وہ
ان کاروبار کو بہتر طور پر انجام دے سکیں۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ ادارہ جات ٹریننگ
کے نظام الاوقات میں ان کے لئے کافی تعداد میں خالی گھنٹے رکھے جائیں یا دوسرے

الفاظ میں نسبتاً دوسرے اداروں کے ادارہ جات ٹریننگ میں زیادہ اساتذہ کو مقرر کرنا ہوگا۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ ٹریننگ کے متعلق عملی کام جو ادارہ جات ٹریننگ اور مدارس میں انجام دیئے جاتے ہیں۔ ان پر نہ صرف اساتذہ کا قابل لحاظ وقت صرف ہوتا ہے بلکہ یہ کام ایسے ہیں کہ جن کی انجام دہی میں اساتذہ کو کافی بار ہوتا ہے اور جن ادارہ جات ٹریننگ میں تحقیقاتی کام ہوتا ہے۔ اساتذہ کو اس کام کی نگرانی اور رہبری میں زیادہ وقت اور محنت صرف کرنی پڑتی ہے۔ مختصر یہ کہ ادارہ جات ٹریننگ میں اساتذہ کی تعداد اس قدر ہونی چاہیئے کہ ان اداروں کے کل کام بغیر رکاوٹ کے انجام پا سکیں۔ اساتذہ کی تعداد کا تعین کرنے میں اس چیز کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ ٹریننگ کے عام اور خاص مضامین کی جماعتوں میں متعلمین کی تعداد زیادہ نہ ہو تا کہ نہ صرف جماعتی تدریس بلکہ انفرادی طور پر حسب ضرورت اہم نکات پر بحث اور تبادلہ آراء ہو سکے۔ غرض کہ مذکورۂ صدر وجوہ کی بناء پر سارجنٹ اسکیم کی تجویز کہ ٹریننگ اسکولوں میں جن میں متعلمین کی تعداد (۳۰۰) ہوگی بشمول صدر (۲۱) اساتذہ اور ٹریننگ کالجوں میں جہاں متعلمین کی تعداد (۲۰۰) ہوگی بشمول صدر (۱۳) اساتذہ مقرر کئے جائیں ناکافی متصور ہوگی۔ اس میں اضافہ کی اس لئے بھی ضرورت ہے کہ جن ادارہ جات ٹریننگ میں دوسرے اداروں کے مقابلہ میں اساتذہ کی تعداد زیادہ ہے وہاں بھی وقتاً فوقتاً یہ محسوس کیا جارہا ہے کہ یہ زائد تعداد بھی ضروریات کے لحاظ سے کم ہے اور اس میں اضافہ کرنا چاہیئے تا کہ کاروبار کی اجرائی میں دقت نہ ہو۔ لہذا مناسب ہوگا کہ اساتذہ کی تعداد کا تعین کرنے میں متعلمین کی تعداد کے ساتھ ساتھ ٹریننگ کے متعلقہ مضامین اور مصروفیات کی تعداد اور اہمیت کو ملحوظ رکھا جائے۔ حسب ذیل اعداد زیادہ موزوں ہوں گے۔

(۵۰) متعلمین تک کی تعداد کیلئے ہر مضمون اور مصروفیت کے لئے (آ) استاد

(۵۰) تا (۱۰۰) متعلمین کی تعداد کے لئے ہر مضمون اور مصروفیت کے لئے (۲) اساتذہ
(۱۰۰) تا (۲۰۰) متعلمین کی تعداد کے لئے ہر مضمون اور مصروفیت کے لئے (۳) اساتذہ
(۲۰۰) تا (۳۰۰) متعلمین کی تعداد کے لئے ہر مضمون اور مصروفیت کے لئے (۴) اساتذہ
البتہ جہاں مضامین یا مصروفیات میں ربط یا تعلق ہو مثلاً (۱) نفسیات تعلیم اصول تعلیم تعلیم اطفال، فلسفہ تعلیم (۲) تاریخ تعلیم، تقابلی تعلیم، مسائل حاضرہ وجدید رجحانات تعلیم (۳) اعلیٰ نفسیات تعلیم، تعلیمی آزمائشات و پیمائشات، نفسیات تعلیم (۴) نظم و نسق تعلیم، تعلیمی انتظامات، تاریخ تعلیم، اصول تعلیم، نفسیات تعلیم (۵) حفظ صحت مدرسہ، جسمانی تعلیم وغیرہ میں یا طریقہ ہائے تعلیم مثلاً (۱) ریاضیات و سائنس (۲) تاریخ و جغرافیہ (۳) تعلیمی دستی کام و نقش کشی (۴) مختلف السنہ کے طریقہ ہائے تعلیم میں جہاں ارتباط پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اساتذہ کی تعداد میں ایک حد تک کمی کی جائے تو مضائقہ نہیں۔

ہندوستان میں چونکہ اب تک ادارہ جات ٹریننگ کے اساتذہ کی تعداد محدود رہی اس لئے بالعموم موزون اشخاص ہی مامور کئے جاتے رہے لیکن آئندہ چونکہ انکی تعداد میں کثیر اضافہ کیا جائے گا اس لئے ضروری ہے کہ آئندہ ایسے اشخاص کا تقرر کیا جائے جو اپنی قابلیت، صلاحیت، تجربہ، سماجی مرتبہ، نیک کردار اور نیک نیتی کی وجہ سے نہ صرف ٹریننگ کے متعلقہ فرائض کو بخوبی انجام دے سکیں بلکہ خود اپنے اور اپنے پیشہ کے وقار کو بڑھا سکیں۔ لیکن ان اوصاف کے حامل اشخاص اساتذہ کی خدمات پر کارگزار رہنا اس وقت ہی پسند کریں گے جب کہ انہیں خاطر خواہ معاوضہ دیا جائے ان کی تنخواہوں اور مشاہروں کے اسکیل مقرر کرنے میں نہ صرف ان کے کام کی نوعیت، ان کی قابلیت وغیرہ کا لحاظ رکھنا ضروری ہے بلکہ ان معاشی اور مالی حالات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے جن کے تحت ان اشخاص کو اپنی ضروریات زندگی کی تکمیل کرنے اور اپنے وقار کو برقرار رکھنے میں مصارف برداشت کرنے

پڑتے ہیں۔ ادارہ جات ٹریننگ کے اساتذہ کی تنخواہوں کے متعلق سارجینٹ اسکیم کے مندرجہ ذیل مجوزہ اسکیل کے تیار کرنے میں مذکورہ صدر امور کو نہ صرف پوری طرح ملحوظ نہیں رکھا گیا بلکہ جس زمانہ میں یہ اسکیل تجویز کئے گئے یعنی ۱۹۴۴ میں عام گرانی میں کمی ہو جانے کے توقعات زیادہ تھے۔ اس کے برعکس گرانی بھی بڑھتی جا رہی ہے بعض نئے محصولات بھی قائم ہو رہے ہیں اور سابقہ کے نرخ میں بھی ایک حد تک اضافہ ہو رہا ہے۔ ان حالات کے تحت سارجینٹ اسکیل کے مجوزہ اسکیلوں میں فی الوقت ۵۰ فیصد اضافہ ہونا چاہیے۔ ساتھ اس کے یہ شرط بھی رہے کہ اگر آئندہ گرانی میں زیادتی ہو تو اس کی مناسبت سے تنخواہوں میں اضافہ کیا جا سکے گا۔ اس انتظام سے موزوں اساتذہ مہیا کئے جا سکیں گے۔

## سارجینٹ اسکیم کے مجوزہ اسکیل

### الف۔ ٹریننگ اسکول

| | | |
|---|---|---|
| ۱۔ انسٹرکٹرس | ۔ | ۱۰۰۔۵۔۱۵۰ |
| ۲۔ " | ۔ | ۱۲۵۔۵۔۱۷۵ |
| ۳۔ اسسٹنٹ پرنسپل | ۔ | ۱۷۰۔۱۰۔۲۵۰ |
| ۴۔ پرنسپل | | ۲۵۰۔۱۰۔۳۵۰ |

### ب۔ ٹریننگ کالج

| | | |
|---|---|---|
| ۱۔ جونیر لکچرار | ۔ | ۱۵۰۔۱۰۔۲۵۰ |
| ۲۔ سینیر لکچرار | ۔ | ۳۰۰۔۲۰۔۵۰۰ |
| ۳۔ پرنسپل | ۔ | ۷۵۰ |

ہندوستان میں معلمین کی ٹریننگ کے اصلاحی پروگرام میں علاوہ قابل تجربہ کار

اور کارکردہ اساتذہ کی مناسب تعداد میں فراہمی کے دوسرے لوازم کو بھی انکی اہمیت اور افادیت کی مناسبت سے جگہ دیجانی چاہیئے۔ مثلاً وہ حضرات جو ہمارے معلمین کی ٹریننگ کے اصلی حالات سے پوری طرح واقف ہیں اس خیال کی تائید کریں گے کہ قابل لحاظ تعداد میں، ہندوستان میں اسوقت ادارہ جات ٹریننگ موجود ہیں جن میں کتب، رسالے، آلات تعلیم، امکنہ عملہ و ملازمین، فرنیچر، کھیل اور اسپورٹ کے سامان، عملی کام کے وسائل وغیرہ ایسے نہیں کہ جن سے ٹریننگ کے کاروبار خاطر خواہ طور پر چلائے جا سکیں۔ ان چیزوں کی کمی یا خامی سے ٹریننگ کا معیار بھی گر رہا ہے اور جو معلمین ان یاتشفی بخش حالات کے تحت ٹریننگ پا رہے ہیں ان سے مدارس کی تعلیم میں برائے نام ترقی ہو رہی ہے۔ لہذا یہ نہایت ضروری ہے کہ قبل اس کے کہ نئے ادارہ جات ٹریننگ کھولے جائیں۔ موجودہ اداروں کے ساز و سامان تعلیمی، تدریسی وغیرہ کی تکمیل کر لی جائے۔ اور جو نئے ادارے کھولے جائیں ان میں بھی ٹریننگ کی تمام ضروریات کو پورا کیا جائے۔

کافی تعداد میں اچھے اساتذہ اور وافر مقدار میں موزوں ساز و سامان و لوازمات ٹریننگ کی فراہمی کے لئے کثیر رقومات درکار ہیں۔ بڑی بڑی اسکیمات کو نظری طور پر تیار کرنا آسان ہے لیکن مالی مشکلات کی وجہ سے بالعموم ان کو روبہ عمل لانا دشوار بلکہ قریب قریب ناممکن سا ہو جاتا ہے۔ ہندوستان کی تعلیم المعلمین کی جدید اسکیمات پر بھی اس بیان کے صادق آنے کا اندیشہ ہے لیکن چونکہ اس تعلیم کی توسیع بھی مقصود ہے اور اصلاح بھی۔ لہذا ایک ایسی تدبیر سوچی جائے جس سے دونوں مقاصد پورے ہوں۔ اس تدبیر کو ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

ہندوستان میں جو ادارہ جات ٹریننگ اس وقت موجود ہیں ان سب کو ہر لحاظ سے بہترین حالت پر لانا چاہیئے۔ مثلاً ان میں قابل تجربہ کار اور کارکردہ اساتذہ جو موجود

ہوں ان کی حوصلہ افزائی کر کے انہیں اپنے کام کو دلچسپی کے ساتھ انجام دینے کا موقعہ دیا جائے اور جہاں ایسے اساتذہ کی کمی ہے وہاں نئے تقررات یا تبادلوں سے اس کمی کو پورا کیا جائے جہاں اساتذہ کی تعداد میں کمی ہے زیادہ اساتذہ کو مامور کرنا چاہیئے۔ اسی طرح کتب آلات تعلیم، امکنہ، فرنیچر، عملہ و ملازمین کھیل کود کے سامان و انتظامات، اقامت خانوں کا قیام یا توسیع وغیرہ کے متعلق جو بھی کمی ہو اس کی تلافی کی جانی چاہیئے۔ ان انتظامات کو روبہ عمل لاکر مذکورہ ادارہ جات ٹریننگ کو اس قابل بنایا جائے کہ یہ اپنے مفوضہ کاروبار کو خاطر خواہ طور پر انجام دے سکیں۔ یہی مقصد آئندہ بھی پیش نظر رہنا چاہیئے۔ یعنی آئندہ کثیر تعداد میں ادارہ جات ٹریننگ میں جو اضافہ کیا جائے گا۔ ان نئے اداروں میں سے کم از کم ۲۰ فیصدی ادارے ایسے کھولے جائیں جو تعلیمی اور تدریسی نقطہ نظر سے خود مکتفی ہوں اور ان میں کسی چیز کی کمی نہ ہو۔ کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ٹریننگ کے مختلف مدارج یعنی تحتانی وسطانی اور فوقانی کی مناسبت سے مذکورہ خصوصیات کے حامل ادارہ جات ٹریننگ قائم کئے جائیں۔ ان کو ایسے مقامات میں قائم کیا جائے جو مرکزی ہوں تاکہ دوسرے ادارے جن میں ساز و سامان وغیرہ اوسط درجہ کے یا اس سے کم ہوں معیاری اداروں سے مختلف طور پر استفادہ کر سکیں۔ یا دوسرے الفاظ میں مذکورہ ادارہ جات ٹریننگ نمونوں کے اداروں کی حیثیت سے شمار کئے جائیں بلکہ مناسب ہوگا کہ ان سے معیاری کام بھی لیا جائے اور ان میں ٹریننگ کی اصلاح اور ترقی کے متعلق بعض نئے مسائل کے حل کرنے کے سلسلہ میں کام بھی کیا جاتا رہے۔ ان اداروں سے عام تعلیم کی توسیع اور اصلاح میں بھی مدد دی جا سکتی ہے۔

معلمین کی ٹریننگ کے چند اور مسائل بھی ہیں جن کی طرف خاص توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً ایک مسئلہ ٹریننگ کے عملی کام سے متعلق ہے۔ جہاں تک اس کام

تعلق اداره جات ٹریننگ سے ہے اور یہ کام ان ادارہ جات ہی میں انجام دیا جاتا ہے۔ کسی بنیادی تبدیلی یا اہم انتظامی رد و بدل کی عموماً کم ضرورت لاحق ہوگی لیکن جہاں اس کام کا تعلق مدرسوں سے ہوتا ہے اور زیادہ تر عملی کام مثلاً مشقی اسباق نمونے کے اسباق، تنقیدی اسباق، بعض موضوعات کے متعلق تجربات وغیرہ مدرسوں ہی میں انجام دیا جاتا ہے وہاں بعض معاملات میں اصلاح کی ضرورت بعض وقت محسوس ہوا کرتی ہے۔ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ کم مدرسے ایسے ہیں جو ادارہ جات ٹریننگ سے متعلق یا ملحقہ ہیں۔ زیادہ تعداد ان مدارس کی ہے جہاں معلمین زیر تعلیم مذکورۂ صدر عملی کام انجام دیتے ہیں لیکن یہ مدارس ادارہ جات ٹریننگ سے علیحدہ ہیں اور ان کے نظام الاوقات تعلیمی و تدریسی تنظیمات اور دیگر انتظامات میں ادارہ جات ٹریننگ یا مقاصد ٹریننگ کا نہ صرف کم لحاظ رکھا جاتا ہے بلکہ ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان مدارس اور ادارہ جات ٹریننگ میں رسمی تعلق ہے اور حقیقت میں ان دونوں کے کاموں میں ربط کے عدم وجود سے دونوں کے کام متاثر ہوتے ہیں۔ اس برائی کو دور کرنے کی ایک تدبیر یہ ہو سکتی ہے کہ مذکورہ مدارس کے تعلیمی و تدریسی انتظامات میں ان ادارہ جات ٹریننگ کی رائے مشورہ کو خاص طور پر ملحوظ رکھا جائے جن کے معلمین زیر تعلیم ان مدارس میں عملی کام انجام دیتے ہیں۔ لیکن محض اس انتظام سے مدارس سے متعلق ٹریننگ کے عملی کام پوری طرح اور اطمینان بخش طور پر انجام نہیں پا سکتے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ ہر ادارہ ٹریننگ کا اپنا مشقی مدرسہ ہو۔ یہ مدرسہ ہر لحاظ سے ٹریننگ کے ادارہ کے ماتحت ہو۔ اس قسم کے مشقی مدرسوں میں طلبار کی تعلیم اور تربیت کی مناسبت سے اور اصول فن ٹریننگ کے مطابق انتظامات مہیا کئے جائیں۔ یہ مدرسے جہاں ٹریننگ کے ورکشاپ ہوں گے وہاں ان کے مفید تعلیمی اور تربیتی انتظامات سے ان کے

طلبا کو زیادہ فائدہ پہونچے گا۔ علاوہ ازیں ادارہ جات ٹریننگ سے متعلقہ یا ملحقہ مشقی مدرسوں کی اس لئے بھی ضرورت ہے کہ بلا روک ٹوک اور دوسروں کی محتاجی کے بغیر ادارہ جات ٹریننگ ان میں اپنے عملی کام دیکھیں گے۔ اور کوئی تعجب نہیں کہ یہ مدرسے تجرباتی مدرسے بن جائیں جہاں اصول اور فن تعلیم کے اہم مسائل کو حقیقی حالات سے مربوط کر کے ان کا موزوں حل دریافت کرنے کی کوشش کی جائے۔

رہا یہ اعتراض کہ ان مدرسوں کا ماحول بالعموم مصنوعی ہوتا ہے۔ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ ان مدرسوں میں بھی جو ادارہ جات ٹریننگ سے ملحقہ نہیں ہیں تقریباً یہی مصنوعیت پائی جاتی ہے۔ اس جواب سے زیادہ مدلّل جواب یہ ہے کہ مشقی مدرسوں کے ادارہ جات ٹریننگ سے ملحق ہونے سے یہ مصنوعیت نہیں پیدا ہوتی بلکہ ان اغراض و مقاصد اور انتظامات سے پیدا ہوتی ہے جو رسمی اور مصنوعی ہیں۔ لہٰذا صائب طریقہ یہ ہے کہ ادارہ جات ٹریننگ سے ملحقہ جن مشقی مدرسوں میں یہ خرابیاں ہوں تو انہیں دور کیا جائے نہ کہ مصنوعیت کا اعتراض پیش کر کے ایک اچھی چیز کو برا ٹھیرایا جائے۔ علاوہ ازیں ایسے ملحقہ مشقی مدرسے موجود ہیں جو اس بات کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ یہ دوسرے مدرسوں سے ہر طرح بہتر ہیں اور ان کی وجہ سے ادارہ جات ٹریننگ کے عملی کام کی اجرائی میں بڑی مدد ملتی ہے۔

لیکن ادارہ جات ٹریننگ سے ملحق اور ان کے ماتحت مشقی مدرسوں کے قیام اور توسیع کی جو تائید اوپر کی گئی اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ دوسرے مدرسوں میں ٹریننگ کے عملی کام کے انجام دینے کی مخالفت مقصود ہے۔ اول تو یہ کہ ٹریننگ کی آیندہ توسیع کی وجہ سے یہ سب کام ملحقہ مشقی مدرسوں میں نہیں انجام دیا جاسکتا اور دوسرے یہ کہ ادارہ جات ٹریننگ سے ملحقہ مشقی مدارس کے علاوہ دوسرے مشقی مدارس میں عملی کام انجام دینے سے متعلمین زیر ٹریننگ کے تجربوں میں وسعت

پیدا ہوگی۔ اس لئے مناسب ہے کہ ٹریننگ کے عملی کام کے لئے دونوں قسم کے
عملی مدرسوں سے استفادہ کیا جائے اور دونوں قسم کے مدرسوں کی توسیع عمل میں لائی جائے
نصابات ٹریننگ سے متعلق بھی چند امور مستحق توجہ ہیں۔ چنانچہ بعض نصابات
کے بارے میں یہ خیال بعض وقت ظاہر کیا جاتا ہے کہ یہ بڑی حد تک نظری ہیں اور
ان کا تعلق عملی زندگی یا مدرسوں کی حقیقی تعلیم سے کم ہے۔ چنانچہ نہ صرف نفسیات
اصول تعلیم، نظم و نسق اور حفظ صحت جیسے مضامین عملی ضروریات کے لحاظ سے معلومات
کو پیش کرنے کی ضرورت ہے بلکہ تاریخ تعلیم جیسے مضامین کو بھی زمانۂ موجودہ کے
حالات اور جدید رجحانات کی روشنی میں حتی الامکان پیش کرنا چاہئے اور خصوصاً طریقہ
ہائے تدریس کے لئے ضروری ہے کہ عملی پہلوؤں کو پیش نظر رکھا جائے نہ کہ اصول
اور نظریوں کی پیش کشی پر زیادہ وقت صرف کیا جائے۔ بعض جگہ یہ رائے بھی
دیجاتی ہے کہ چونکہ حالات حاضرہ اور ضروریات زمانہ کی وجہ سے عام تعلیم کے مقاصد
اور مشتملات میں ترمیم اور تبدیل کیا جارہا ہے اور نئے مضامین اور مصروفیات کو
عوام کی تعلیم میں جگہ دی جارہی ہے۔ اسی کی مناسبت سے ٹریننگ کے نصابات
میں بھی نئے مضامین کو شامل کرنا چاہئے تاکہ معلمین زیر تعلیم ان نئے مضامین کے
متعلق تعلیمی اصول اور فن سے واقف ہوکر ان مضامین کو مدرسوں میں درست
طریقہ پر پڑھا سکیں۔ چنانچہ اس خیال کے تحت تعلیم بالغان، روزگارانہ اور پیشہ وارانہ
تعلیم کی مبادیات، تعلیم اناث کے سلسلہ میں خصوصی مضامین، تعلیم شہریت وغیرہ
جیسے مضامین کو نصابات ٹریننگ میں شامل کرنے پر توجہ دلوائی جاتی ہے۔ بعض
اشخاص کا یہ بھی اعتراض ہے کہ معلمین زیر ٹریننگ کو عملی یا مشقی اسباق دینے کا کم موقعہ
دیا جاتا ہے، ان اسباق کی تعداد بہت ہی کم ہے اور زیادہ وقت لکچروں پر صرف
ہوتا ہے۔ ان کی رائے میں نہ صرف مشقی یا عملی اسباق کی تعداد میں اضافہ کرنا چاہئے۔

غرضیکہ مذکورہ صدر خیالات کی واجبیت سے کسی کو اختلاف نہیں اور جن نصابات ٹریننگ میں دراصل کوئی کمی ہو تو اس کمی کو دور کرنا بہر صورت مفید ہے لیکن ظاہر ہے کہ بعض نصابات میں ردوبدل کرنے سے کوئی سود مند نتیجہ نہیں حاصل ہو سکتا۔ جب تک کہ مرممہ نصابات کو روبہ عمل لانے کے پورے پورے انتظامات نہ کئے جائیں یہ انتظامات عملاً نہیں کئے جاسکیں گے۔ تاوقتیکہ ادارہ جات ٹریننگ میں اچھے اساتذہ اور دیگر لوازمات کی فراہمی نہ کی جائے۔ اس کے لئے زیادہ رقم صرف کرنا حقیقی معنوں میں کفایت شعاری ہے۔

بعض نصابات اور انتظامات ٹریننگ کی ناموزوں ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ بعض جگہ معلمین زیر ٹریننگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ٹریننگ کی کامیابی سے ان کو صرف یہ فائدہ پہونچتا ہے کہ انہیں اسناد مل جاتی ہیں۔ اور یہ بلحاظ ضابطہ ترقی کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو صریح الفاظ میں کہہ دیتے ہیں کہ جن مدرسوں میں وہ جائیں گے وہاں علم و فن تعلیم کی معلومات کو عمل میں لانے کا موقع انہیں نہیں دیا جائے گا۔ ممکن ہے کہ ان بیانات میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہو لیکن واقعہ ہے کہ عام طور پر ادارہ جات ٹریننگ اور مدرسوں میں کم ربط پایا جاتا ہے۔ اور کوئی ایسا انتظام نہیں ہے کہ جس کے تحت ادارہ جات ٹریننگ معلوم کرسکیں کہ آیا ٹرینڈ مدرسین درست اصول پر تعلیم و تدریس کا کام مدارس میں انجام دے رہے ہیں یا نہیں۔ ادارہ جات ٹریننگ اور مدارس میں مفید ربط پیدا کرنے کی ایک تجویز یہ ہوسکتی ہے کہ وقتاً فوقتاً ادارہ جات ٹریننگ کے ماہر اساتذہ کے ذریعہ مدارس کے تدریسی کام کا معائنہ کرایا جاتا رہے اور ان معائنوں کی رپورٹ کی بناء پر سررشتہ متعلقہ کی طرف سے کارروائی کیجائے۔

اعادی نصابات کے انعقاد کے ذریعہ اب یہ کوشش کی جارہی ہے کہ علم اور فن تعلیم کے متعلق ٹرینڈ مدرسین کی معلومات کو تازہ کیا جائے لیکن اب تک ان نصابات کا تعلق

بالعموم قبل طلیسانی ٹریننگ سے رہا ہے۔ طلیسانی ٹریننگ میں بھی اسی قسم کے نصابات کا انعقاد عام طور پر کیا جانا چاہیئے۔ اس کے سوا جن موجودہ اعادی نصابات میں حسب ذیل امور کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ ان کا لحاظ رکھنا چاہیئے تاکہ اعادی نصابات سے پورا پورا فائدہ حاصل کیا جا سکے۔

۱۔ ان نصابات کا ایک مقصد یہ بھی ہونا چاہیئے کہ ٹریننگ کے مختلف مضامین اور مصروفیات میں جو نئے رجحانات رونما ہوئے ہیں ان میں سے اہم کو اعادی نصابات کے سلسلہ میں پیش کیا جائے۔

۲۔ اعادی نصابات ایسے وقت رکھے جائیں جب کہ شرکا اور اساتذہ کو ان نصابات کی وجہ سے بار یا تھکن محسوس نہ ہو۔ اور ایسے وقت جبکہ ادارہ جات ٹریننگ اور مدارس کی تعلیمی میقات جاری رہیں تاکہ حسب ضرورت ان دونوں سے اعادی نصابات کے سلسلہ میں استفادہ کیا جا سکے۔

۳۔ اعادی نصابات کو حتی الامکان رسمیت سے دور رکھنا چاہیئے۔ اور شرکا کو موقعہ دینا چاہیئے کہ مدارس کی تعلیمی اور تدریسی کام کے سلسلہ میں اگر ان کے تجربوں میں کوئی مسائل حل طلب ہوں تو اعادی نصابات کے موقع پر ان کو دریافت کر سکیں مگر خیال یہ رہنا چاہیئے کہ ان مسائل کے متعلق استفسارات علمی اور فنی نوعیت کے ہوں گے۔ کیونکہ اعادی نصابات کا مقصد تعلیمی ہے۔

ہندوستان میں کہیں کہیں تعطیلی، خاص اور مختصر نصابات سے معلمین کی تعلیم کی توسیع اور ترقی کا عملی رجحان دکھائی دیتا ہے۔ یہ ایک نہایت ہی مفید تحریک ہے اور جب کہ معلمین کی ٹریننگ کو وسیع پیمانہ پر رائج کرنا مقصد ہے تو گویا مذکورہ نصابات کی توسیع سے اس مقصد کی تحصیل میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ ان نصابات کی تفصیلات ان میں اعادی نصابات میں اور مستقبل ٹریننگ کے مسائل میں ارتباط پیدا کرنے کی

تدابیر اور متعلقہ انتظامات کو نافذ کرنے کی تجاویز پر جلد از جلد توجہ منعطف کرنا مناسب ہے۔
ہر ملک کی تعلیم میں حقیقتاً ادارہ جات ٹریننگ اور ان کے مفوضہ کاروبار کو ایک ممتاز جگہ حاصل ہے اور جہاں انہیں عملاً یہ مرتبہ نہیں دیا گیا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہاں کی عام تعلیم اپنے اصلی مقصد کو پہونچنے سے قاصر رہے گی۔ ادارہ جات ٹریننگ اپنے فرائض منصبی کو اس وقت ہی پورا کر سکتے ہیں جبکہ ان کی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے انہیں موقع دیا جائے کہ اپنی تمام مصروفیات کی نشو نما کر سکیں ادارہ جات ٹریننگ کا کام متعلمین کی تعلیم ہے۔ اور متعلمین کا کام طلبار کی تعلیم تعلیم زندگی کی تیاری بلکہ زندگی ہے۔ زندگی کے تین پہلو ہیں۔ جسمانی، ذہنی، اخلاقی۔ ان تینوں شعبوں کی نشو نما کرنا معلم کا فرض ہے۔ اور یہی فرض ادارہ جات ٹریننگ کا بھی ہے اس فرض کو ادارہ جات ٹریننگ اس وقت ہی انجام دیسکتے ہیں جب کہ ان کے ہاں اپنے متعلمین کی جسمانی، ذہنی اور اخلاقی تعلیم یا ٹریننگ کے وسائل اور انتظامات موجود ہوں۔ راست یا بالواسطہ طور پر ادارہ جات ٹریننگ کا تعلق نہ صرف زندگی ہی ہے بلکہ اس متحرک زندگی سے جو طلبار مدارس کی فعلیت سے ظاہر ہوتی ہے پستی، پست ہمتی اور پژمردگی کو ادارہ جات ٹریننگ سے دور رکھنا چاہیئے تاکہ زندگی اور زندہ دلی سے یہ ادارے آئندہ نسلوں کی زندگی کی تعمیر کر سکیں۔

# ہمارے ملک کا اصول اور نصاب تعلیم

تقریباً ۶۵ سال ہوتے ہیں کہ حیدرآباد نے اپنے تعلیمی ماحول کو بالکل بدل دیا اور ہندوستانی جامعات کی تقلید اوس کے لئے بہتر تصور کی گئی۔ اس تعلیمی پالیسی کے نتائج کا اندازہ کرتے ہوئے سر وقار الامراء مدار المہام وقت نے ۱۸۹۴ء میں نظام کالج کے جلسۂ تقسیم انعام میں بصدارت حضرت غفران مکان تقریر فرمائی تھی کہ۔

"شائد سامعین و حاضرین مجھ سے اس امر میں متفق ہوں گے کہ ہمارے ملک اور اس ریاست کی ضرورتیں دیگر ممالک اور اقوام سے بہت کچھ فرق رکھتی ہیں کیا اچھا ہو کہ ان ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر ہم بھی ایک طریقۂ تعلیم کا اختراع کریں۔ مغربی السنہ اور مغربی علوم و فنون کے بغیر ہم کو گزیر نہیں۔ اگر فی الحال ہم دیگر شائستہ اور مغربی اقوام کی پیروی کرنا چاہیں یا اپنے ہمسایوں سے ہمسری کرنا چاہیں تو مغربی تعلیم سے مستفید ہو کر کر سکتے ہیں۔ مگر یہ کیا ضروری ہے کہ ہم اس تقلید کو اس درجہ تک بڑھائیں کہ اپنی ضروریات کو فروگزاشت کر دیں"

اس کے بعد حضرت غفران مکان نے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ۔

"تدریس مذہبی کے ساتھ تہذیب اخلاق اور تعلیم جسمانی فروگزاشت نہ کی جائے۔ یقین ہے کہ نواب مدار المہام صاحب جلد تر امراء اور دیگر ضروریات ملک کو پیش نظر رکھ کر ایک مفصل اسکیم پیش کریں گے"

اس تقریر پر ۲۵ سال گزر چکے ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ ان خیالات عالیہ کی تعمیل ہیں

سررشتۂ تعلیمات نے کوئی پیش روی نہیں فرمائی اور مدرسۂ یونیورسٹی کے تحت تعلیم جاری تھی اور اس تعلیم میں ضروریات ملک کا لحاظ چنداں نہیں کیا جاتا تھا۔ سررشتۂ تعلیمات نے مکمل نظام تعلیم کو جو قدیم سے چلا آرہا تھا یکسر بدل دینا ضروری سمجھا مگر جب اس کے نقائص ظاہر ہونے لگے تو اس کا احساس اور اعتراف کیا جاتا تھا مگر عملیت کی جانب کوئی توجہ نہ ہوتی تھی۔

ایجوکیشنل کانفرنس ۲۳ سال قبل قائم ہوی اور اس لئے قائم ہوی کہ ملک کی تعلیم میں اصلاح کی جائے۔ اس کے اولین اجلاس میں حیدر نواز جنگ مرحوم نے جو رہنمائی بہ حیثیت صدر نشین کانفرنس ملک کی تعلیم کے متعلق فرمائی تھی اس میں ان کے چند اہم فقرے آج بھی ہمارے لئے پیغام عمل ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ۔

"میرا خیال ہے اور مجھے اس پر کامل وثوق ہے کہ ہماری علمی ترقی کا اگر کوئی صحیح راستہ ہوسکتا ہے تو وہ یہی ہے کہ تقریباً ایک صدی کے تجربہ نے یہہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچا دی ہے کہ خالص مغربی تعلیم ہمارے ملک کیلئے مفید نہیں ہوسکتی۔ جس تعلیم میں ملکی ضروریات کا لحاظ نہ ہو اور جس کی بنیاد ملکی اور قومی خصائص پر نہ ہو وہ کوئی تعلیم نہیں۔ اسی طرح خالص مشرقی تعلیم بھی موجودہ زمانہ کی ضروریات کے لحاظ سے سودمند نہیں ہوسکتی۔ ایک ہمیں ملک و قوم سے بیگانہ کردیتی ہے اور دوسری زمانہ حال کی ترقی اور روشنی سے محروم رکھتی ہے۔ دونوں الگ الگ ناقص اور نامکمل ہیں۔ اس لئے ضروری اور لابد ہے کہ دونوں کی خوبیوں کو ایک جگہ جمع کیا جائے اور ایک ایسا نصاب تعلیم تیار کیا جائے جو حقیقی علم و اخلاق کا سرچشمہ ہو۔ لیکن اسے کامیاب بنایئے اس سے مستفید ہونے کے لئے آئیں گے اور حیدرآباد مرکز علوم و فنون بن جائے گا۔

لیکن اسے کامیاب بنانے کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ ایک خاص مدت تک علوم اپنی زبان میں سکھائے جائیں۔ غیر زبان کے ذریعہ علم حاصل کرنے میں جو نقصان عظیم ہمیں پہونچا ہے وہ ایسا نہیں ہے کہ اب اس سے درگزر کیا جائے اور اسکی تلافی اور آئندہ کے اصلاح کا کوئی خیال نہ کیا جائے اس سے نہ صرف ہمارے بچوں اور نوجوانوں کے دماغوں پر بہت بڑا بار اور بہت برا اثر پڑتا ہے بلکہ جدت طبع اور رسائی ایک حد تک معطل ہو جاتی ہے یہ امر بہت قابل اطمینان ہے کہ سررشتہ تعلیم اس مسئلہ پر غور کر رہا ہے اور جامعہ عثمانیہ کی ترتیب میں اسے خاص طور سے ملحوظ رکھا گیا ہے لیکن اس کے لئے لازمی ہے کہ ہم اپنی زبان کو علمی کتاب سے مالا مال کردیں تاکہ علم کی تحصیل میں ہمارے طالب علم اور اہل ملک کو دقت نہ رہے۔ کوئی صاحب یہ خیال نہ کریں کہ میں مغربی تعلیم یا انگریزی تعلیم کا مخالف ہوں بلکہ میں اس کا بھی ویسے ہی حامی ہوں جیسے مشرقی تعلیم کا لیکن میرا خیال یہ ہے کہ عام طور پر قطع نظر بعض مستثنیات کے ابتدائی مدارج میں انگریزی تعلیم بجائے مفید کے مضر ہوتی ہے البتہ اعلیٰ مدارج میں اسکی تعلیم بطور زبان ضروری اور لازمی ہے۔ بغیر اس کے ہم ہرگز صحیح اور حقیقی معنوں میں تعلیم یافتہ نہیں ہوسکتے ممکن ہے یہ طریقہ برٹش انڈیا میں مفید نہ ہو کیوں کہ وہاں بغیر انگریزی تعلیم کے اعلیٰ ترقی ممکن نہیں اس لئے کہ وہاں کے تمام بڑے بڑے دفاتر میں نیز سرکاری بڑے بڑے دفاتر میں نیز سرکاری خط و کتابت میں انگریزی کی ضرورت ہے لیکن برخلاف اس کے ہماری ریاست کی سرکاری اور دفتری زبان اردو ہے۔ اور یہاں کے حالات برٹش انڈیا کے حالات سے مختلف ہیں"

اس کے بعد انہوں نے یہ فرمایا تھا کہ خدا چاہے تو چند سال میں دارالعلوم ایک عظیم الشان یونیورسٹی ہو جائے گی جس کی نظیر ہندوستان بھر میں نہ ہوگی اور جس کا فیض دور دور پہونچے گا۔ اور لوگ ملک ملک سے اس سے مستفید ہونے کیلئے آئیں گے اور حیدرآباد مرکز علوم و فنون بن جائے گا۔

ان الفاظ کو پبلک پلیٹ فارم پر ظاہر ہو کر ۳۳ سال ہو چکے ہیں اور اسکے
تیسرے سال سے ہی جامعہ عثمانیہ کی بنیاد قائم ہو گئی اور آج وہ ایک بڑے اہم تعلیمی
قابل فخر کارنامہ حیدر آباد کے لئے ہو چکا ہے۔ ممالک مغربی میں ہندوستان کی اسلامی
دنیا کے کسی تحریک نے استقدر توجہ پیدا نہ کی جس قدر جامعہ عثمانیہ کی بدولت انکا ہیں
متوجہ ہو گئیں ۔

جامعہ عثمانیہ کی علمی ترقی اور علمی ماحول اور علمی فیض سے تو انکار نہیں مگر سوال
یہی ہے کہ حیدر نواز جنگ کے جو تخیلات تھے وہ کہاں تک پورے ہوئے ہیں۔
امتزاج علوم مشرق و مغرب کہاں تک مکمل ہوا ہے اور کہاں تک ملک کے بچے اور
نوخیز نسل ابتدائی تعلیم میں انگریزی سے بے نیاز ہوئی ہے اور جامعہ عثمانیہ کے
پروفیسر اور طیلسانین نے چند مستثنیٰ مثالوں کو نظر انداز کرنے کے بعد عام طور پر اپنے
ملک کی زبان کو کس قدر علمی کتابوں سے مالا مال کیا ہے اردو کے ذخیرۂ علوم و
فنون میں ترجمے کو چھوڑ کر تالیف و تصنیف میں کتنا حقیقی اضافہ ہوا ہے۔ جامعہ عثمانیہ
کی بہت سی شریک نصاب کتابیں وہی ہیں جو پچیس تیس برس پہلے ترجمے ہوئے تھے
کیا محترم پروفیسران جامعہ اور طیلسانین نے سائنس، ریاضی، معاشیات اور تاریخ
میں کوئی حقیقی اضافہ ایسا کیا ہے جس پر بیرونی دنیا کی توجہ تو در کنار خود ہمارے
ملک کے علمی طبقات ان پر التفات کرتے ہیں۔

آج بھی ۳۳ سال کے بعد اور مسٹر میکنزی کی رپورٹ اور حکومت کے تصفیہ کے
بعد بھی خالص مغربی تعلیم کا جداگانہ نظام تعلیم جامعہ مدراس کے تحت ہنوز قائم ہے
ہمارے سینکڑوں گراجویٹوں کی جدت طبع اور رسائے ذہنی کہاں تک ترقی
پائی ہے۔ آج بھی ہر ایک بچہ کے والدین یا سر پرست اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ اون کی
اولاد کی تعلیم میں بہت سا نصاب ایسا شامل ہے جو ان کی آئندہ زندگی کے لئے

مطلقاً کار آمد نہیں اور جو مدرسے میں پڑھنے کے بعد طاق نسیاں پر رکھ دیا جاتا ہے
ہم میں سے ہر شخص یہ دیکھتا ہے مدرسہ کھلنے بند ہونے کے وقت میں لڑکے
لڑکیاں کتابوں کا ایک بڑا بوجھ ہاتھ میں لئے ہوئے چلے جا رہے ہیں یہ کتابیں
جو پڑھتے ہیں کہاں تک طالب علم میں بلند خیالی بلند نظری پیدا کرتی ہیں اوران لڑکے
لڑکیوں کو جو تعلیم دیجاتی ہے وہ کہاں تک ان کے تہذیب، اخلاق، شایستگی،
خدا شناسی میں ممد و معاون ہو سکتی ہے۔

ہمارے ملک کے سینکڑوں نہیں، ہزاروں لڑکیاں مدرسہ میں جاتی ہیں اور
چوتھی جماعت سے انگریزی تعلیم ان کی محور توجہ ہو جاتی ہے سب سے زیادہ اسی
مضمون کو وہ پڑھتی ہیں اس کے دو ایک سال بعد سے حساب جبر و مقابلہ۔ اقلیدس
سائنس بھی ان کے تعلیمی نصاب میں شامل ہو جاتے ہیں اور عملاً یہ دیکھا جاتا ہے کہ
تمام طالبات کو گویا یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے تیار کیا جا رہا ہے۔ صورت حال یہ ہے
کہ ابتدائی اور وسطانی جماعتوں میں ہی ہزاروں لڑکیوں کی تعلیم ختم ہو جاتی ہے اور
فوقانی مدارج کے بعد بھی بہت سی لڑکیاں مدرسہ اور تعلیم کو خیرباد کر دیتی ہیں۔ ہو
کالج میں ترقی پانے والے لڑکیوں کا اوسط شاید فی صدی ۲ سے بڑھ کر نہ ہوتا
کیا یہ قابل غور نہیں ہے کہ ان دو لڑکیوں کی خاطر سے ۹۸ لڑکیوں کی تعلیم انکی
زندگی کی ضرورتوں کے لحاظ سے خود مکتفی نہ بنائی جائے۔ جو لڑکیاں ابتدائی
اور وسطانی تعلیم پر مدرسہ کو چھوڑ دیتی ہیں ان کے لئے بلکہ فوقانیہ مدارس
کے لئے کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ ریاضی کی بھول بھلیاں یا انگریزی کی ضرورت
سے زیادہ تعلیم دینے کی بجائے اون کو ضروریات خانہ داری۔ تربیت اولاد
کی کافی تعلیم دیجائے جس کا کام اون کو اپنی تمام زندگی میں پڑتا ہے۔

لڑکیوں کو چھوڑ کر خود لڑکوں کی تعلیمی حالت بھی اسی طرح قابل غور ہے

لڑکے ہر سال ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد میں ابتدائی یا وسطانی تعلیم پر مدرسہ چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کی تعلیم کہاں تک خود مکتفی ہے وہ انتہائی غور کے قابل ہے۔ ہر طالب العلم کے لئے وسطانی جماعتوں کو فوقانی اور کالجی تعلیم کا ذریعہ بنانا کہاں تک کار آمد ہے سنجیدہ غور کے قابل ہے۔

۴۳ سال کا طویل زمانہ گزر چکا اور یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ افراد جو سررشتۂ تعلیم کی ذمہ داریوں کے حامل ہیں اس مینارہ روشنی کی طرف نگاہ نہ ڈالی ہے جس کو حیدر نواز جنگ نے متذکرہ بالا الفاظ کے ذریعہ قائم فرما دیا تھا۔ ذمہ داران تعلیم جب ترتیب نصاب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ان کو اس ماحول سے علیحدہ ہونے کی جرارت نہیں ہوتی، جس سے وہ مانوس ہو چکے ہیں۔ اگرچہ وہ خود اس کی ضرورت اور اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں

۴۳ سال کے بعد سارے ہندوستان میں تعلیمی نقائص کا اعتراف بڑے بڑے افراد نے صراحت کے ساتھ کر دیا ہے۔ اب ہمارے تعلیمی ماحول کو بدلنے کی طرف رائے عامہ مطالبہ کر رہی ہے اور خود ماہران تعلیم بھی اس کا اعتراف کر رہے ہیں اور ہندوستان سے قطع نظر سارے یورپ میں بھی مغربی نظام تعلیم کے خلاف خیال آرائیاں ہو رہی ہیں اس کی تفصیلات محترم مولوی محمد سعید الرحمان خاں صاحب واضح فرما رہے ہیں

نواب سعید الملک بہادر سابق صدر اعظم نے اختتام جنگ کے بعد دو لاسکی نشریات میں مغربی دنیا کو یہ پیغام دیا ہے کہ وہ اپنے نظام تعلیم کی طرف متوجہ اور اس میں ایسی تبدیلی پیدا کرے کہ جس سے نقائص کم ہوں۔ اوس میں خدا پرستی اخلاق انسانیت کے تفصیلات کو شامل کرنا چاہئے۔ نئے صدر اعظم بہادر نے بھی اپنا پہلا پیغام باشندگان حیدر آباد کو جو دیا ہے اس میں یہ بھی ہے کہ "تعلیم عامہ کی توسیع کے ساتھ صحیح سمت میں آگے بڑھنا ہے۔" اور حیدر آباد کی نسبت یہ فرمایا ہے کہ " وہ مشرقی تہذیب و تمدن اور علمی و ذہنی مصروفیات کا شاندار مرکز بن سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ تعلیم عامہ کی صحیح سمت

کیا ہے۔ مشرقی تہذیب و تمدن اور علمی و ذہنی مصروفیات کس طرح اس شہر نہیں بلکہ سارے
ممالک محروسہ میں پیدا کئے جا سکتے ہیں۔

یہ کہنے کی جسارت کیجاتی ہے کہ اس ۳۲ سال میں تعلیمی نقائص کی اصلاح کیلئے
بہت کچھ کہا گیا مگر جو تجاویز قلمبند ہوتے رہے وہ کم نافذ ہوئے اور جس قدر نافذ ہوئے
وہ کامل اصلاح نہ کر سکے ہیں۔ سارے ہندوستان میں بھی صحیح چارہ کار اور صحیح نظام
تعلیم کی کامل رہنمائی ہنوز نہیں ہوئی ہے۔

واردھا اسکیم بہت عرصہ قبل بنائی گئی۔ اس کی نسبت یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ
اس میں ہر طبقے اور ہر فرقے کے لئے یکسانیت ملحوظ نہیں رکھی گئی ہے اور اس میں
مذہب کا جز جس کو ہندوستان کے قدیم نظام تعلیم میں بہت زیادہ ملحوظ رکھا جاتا تھا
نظر انداز کیا گیا ہے اور ملحوظ بھی۔ ہندو مذہب کی حد تک رکھا گیا ہے۔ حال میں سارجنٹ
اسکیم کے نام سے ایک تفصیل سامنے آئی ہے اس کا مطالعہ بھی یہ بتاتا ہے کہ اول تو
اس میں بھی مذہب کو بڑی حد تک نظر انداز کیا گیا ہے اور پھر اس میں تعلیم اتنی مہنگی کر دی گئی
ہے کہ اس کی برداشت مشکل دکھائی دیتی ہے۔

ہندوستان میں صدیوں سے ہندوؤں میں اعلیٰ تعلیم اور خداشناسی کی تعلیم برہمنوں
کی حد تک ضروری تصور کر لی گئی ہے۔ عامتہ الناس کے لئے کسی مورتی کے سامنے جھک جانا
یا اوپر جنے کی تھالی کے سامنے گھنٹی بجانا کافی تصور کر لیا جاتا ہے۔ جب مسلمان اس ملک میں
آئے تو ہندوؤں نے مذہبی اعلیٰ تعلیم کو برہمنوں کے لئے کافی سمجھ لیا اور اوس کا علیحدہ
انتظام قومی طور پر قائم رکھا۔ اور عام طور پر مذہبی تعلیم ضروری نہیں تصور کی ابتدائی تعلیم
کے بعد جو ان کے ہی قومی مدارس میں ملتی تھی وہ اپنے کاروبار میں مصروف ہو جاتے تھے
یا مسلمانوں کے ساتھ فارسی تعلیم میں متوجہ ہو جاتے تھے اور سرکاری ملازمت حاصل کر لیتے
تھے۔ جب ہندوستان میں انگریز حکمران ہو گئے اور ان کے مدرسے جابجا جاری

ہونے لگے تو انہوں نے بجائے فارسی کے انگریزی مدارس اور انگریزی تعلیم اور انگریزی علوم کو پسند کیا۔

برہمن مذہبی درس گاہوں میں حسب ضرورت تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اور یہ کافی سمجھ لیا گیا کہ جب برہمن مذہب سے حسب ضرورت واقفیت ہے تو مذہبی تقریبات اور مراسم ان کے ذریعہ انجام پا سکتے ہیں۔ باقی تعلیم جو کچھ حاصل کرنا ہے وہ سرکاری مدارس کے ذریعہ حاصل کریں۔ اور اس پر قناعت کر لی گئی کہ انگریز ذمہ داریاں سررشتہ تعلیم جیسی کچھ تعلیم ان کے لئے مناسب سمجھیں اس کو حاصل کیا جائے مسلمانوں کے لئے یہ صورت کسی طرح کارآمد نہیں ہو سکتی تھی جب سے وہ ہندوستان میں حکمران ہوئے مسلمان بچوں کی تعلیم مذہبی اور اخلاقی تعلیم کا کافی حصہ جز لازم بنا رہا اور انگریز مدرسوں کی بدولت ان کی تعلیم میں انقلاب عظیم پیدا ہو گیا اور اسی انقلاب کو دیکھتے ہوئے علیحدہ دینی مدارس گزشتہ سو سال میں جا بجا قومی سرمایہ سے قائم ہوتے رہے۔ حالانکہ اس کے سو سال پہلے تک علیحدہ دینی مدرسوں کا یہ اہتمام نہ تھا علماء کے گھر اور خانقاہیں، مساجد بجائے خود کالج تھے۔

انگریزوں کے مدرسے خاص ان کے ہی قوم کے بچوں کے لئے خواہ وہ برطانیہ میں ہوں یا ہندوستان میں یا نوآبادیات میں ہر جگہ موجود ہیں۔ ان میں بائیبل وغیرہ جزو تعلیم دینی چلی آ رہی ہے اور پھر علیحدہ ڈیونٹی کی فیکلٹیاں جامعات اور کالجوں میں جدا موجود ہیں جہاں کافی تعداد میں اعلیٰ ترین مذہبی تعلیم دی جاتی ہے۔ او امتحانات لیکر ڈگریاں ملتی ہیں اور اب بھی انگلستان کے جامعات کیمبرج اور آکسفورڈ تک میں شعبہ ڈیونٹی موجود ہیں۔ مغربی تعلیم میں گزشتہ سو سال میں مادیت اور خدا سے بے نیازی کا رجحان پیدا ہو رہا ہے۔ مگر دنیا کی عالمگیر جنگ کے نتائج مغربی دنیا کو تعلیمی ذہنیت کو بدلنے کی طرف مائل کر رہی ہیں۔

انگلستان میں ۱۹۴۲ء میں جدید قانون تعلیم کا نفاذ ہوا ہے۔ اس میں مذہبی تعلیم کو لازمی رکھنے سے متعلق اور مذہبی عبادات خود مدرسے میں ہونے کے متعلق کافی تفصیلات اور پابندیاں موجود نظر آتے ہیں۔

گزشتہ ستر سالہ تعلیمی نتائج اور تجربات ہمارے لئے انتہائی سنجیدہ التفات کے طالب ہیں کہ بچوں کی تعلیم کی تفصیلات پر انتہائی غور و فکر کیا جائے اور جدید تعلیمی حالات کے پیدا کرنے میں یورپ کی نقالی سے گریز کیا جائے۔

اکثر سنجیدہ حلقوں میں ہی زیادہ سنائی دیتا ہے کہ موجودہ تعلیمی نقائص تو تسلیم ہیں مگر ان کی تبدیلی کن اصول پر کیجائے۔ اس کو بتانا ہر ایک کے لئے ممکن نہیں البتہ یہی طریقہ کارآمد ہو سکتا ہے (اور اس کے متعلق راقم نے بار بار اظہار خیال کیا ہے) کہ دو تین سو ہر نقطہ خیال کے ماہران تعلیم کو جمع کیا جائے اور ان کیساتھ ہر طبقہ ملک کے سنجیدہ سرکاری و غیر سرکاری افراد بھی شامل رہیں اور سب ملکر اس پر غور کریں کہ اس ملک کا قدیم نظام تعلیم کیا تھا اور نصاب میں کیا کیا علوم و فنون تھے اور طریقہ تعلیم کیسا تھا اور اب موجودہ نصاب اور اصول تعلیم کس حد تک ہماری ضروریات کے لئے غیر موزوں اور کلیتًا مفید نہیں ہے اور اس پر بھی غور کیا جائے کہ خود انگلستان کے اصول و نصاب مضامین تعلیم اور خاص کر ابتدائی سے لیکر فوقانی تعلیم تک کیا ہیں اور یہ تفصیلات بھی معلوم کر لئے جائیں جو مشرق اور مغرب میں ماہران تعلیم نے جدید تبدیلیوں کے متعلق ظاہر کئے ہیں اور پھر اس کانفرنس کی سب کمیٹیاں ہر ایک شعبہ تعلیم کے متعلق غور کرنے اور تبدیلیوں کے متعلق اظہار رائے کے متعلق قائم ہوں اور ان سب کمیٹیوں کی روداد میں جب مکمل ہو جائیں تو پھر ان کو جنرل کانفرنس میں یکے بعد دیگرے تفصیلی غور کے لئے لایا جائے اور بالآخر بعد غور و بحث اس طرح جو لائحہ عمل قلمبند ہو اس پر بعد اشاعت عام عمل آوری کیجائے۔

بہر حال اب وقت آگیا ہے کہ خیال آرائی سے نکل کر عمل کی طرف متوجہ ہوں آئندہ نسلوں کی صلاح و فلاح کی ذمہ داری اچھی تعلیم اچھے مدرسین پر ہی ہوتی ہے جو کچھ نقائص ہیں اور جو نتائج پیدا ہوئے ہیں وہ روشن ہیں اور اس کی اصلاح میں تقاید اور جمود کو قطعاً چھوڑ دینا چاہیئے۔ مدارس کی تعداد ہر گاؤں اور قصبہ میں بڑھانے سے پہلے یہ امر قابل غور ہے کہ کیا چیز پڑھائی جائے اور کس طرح پڑھائی جا سکے۔ طوطے کی طرح رٹانا اور غیر ضروری اور غیر مفید تعلیم کو چھوڑ دینا چاہیئے خواہ اس میں انفرادی نقطہ خیال کچھ بھی رہے اور تعلیم عامہ کو صحیح سمت میں بھی پھیلانا کارآمد ہے ورنہ ضیاع وقت اور ضیاع رقم کے نتائج لازمی ہیں اور اس کی پیش بینی سررشتہ تعلیم کا اولین اور لازمی فریضہ ہے۔

حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس کے ہر صدر جلسہ نے اصول و نصاب تعلیم کی تبدیلی سے متعلق کامل تفصیل کے ساتھ توجہ دلائی ہے اور نواب مرزا یار جنگ بہادر نے تفصیلات کے ساتھ اس کا اظہار کیا ہے کہ ہر ایک طبقہ کے ضروریات کے لحاظ سے تعلیم کا علحدہ علحدہ سلسلہ رہنا چاہیئے۔

مولوی محمد عبد الرحمان خانصاحب نے اپنے خطبہ ہائے صدارت میں اور آنریبل نواب ظہیر یار جنگ بہادر صدر المہام امور مذہبی نے اپنی صدارت ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ گلبرگہ میں بھی اس پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ مولوی غلام احمد خاں صاحب، مولوی سید علی اصغر صاحب بلگرامی نے بھی اپنے اپنے صدارت ناموں میں اس کو واضح کیا ہے اور ان سب کا اعادہ غیر ضروری ہے۔ موجودہ معزز صدر المہام صاحب تعلیمات کے لئے سب سے اہم تر ضرورت اس کی ہے کہ بلا منصوبہ تعلیم کی وسعت کے بجائے جس کی بدولت تعلیمی سیلاب قائم بندیوں کے ساتھ نقصانات کا بھی ذریعہ ہو جا سکتا ہے۔ مناسب اور صحیح اصول کی تعلیم کے نظام العمل کے مرتب کرنے میں اولاً اپنی پوری

توجہ منعطف فرماویں اور اوپر جو طریقہ تبلایا گیا ہے کہ ایوان صدارت عظمیٰ میں بہترین افراد ملک اور بہترین ماہران تعلیم کا نفرنس جمع ہو اور وہ اپنا لائحہ عمل مرتب کرے اور پھر عملی طور پر اس کا نفاذ کیا جائے۔ ملک کے نظام تعلیم کو صحیح اصول پر منطبق کرنے کی ضرورت اس سے زیادہ شدت سے محسوس نہ ہوئی تھی جیسا کہ اب ہو رہی ہے اور حکومت سرکار عالی کے لئے اس سے زیادہ کوئی اہم امر نہیں ہے کہ تعلیم کی وسعت کے ساتھ صحیح اصول کے تعلیم کو بھی فوراً ہاتھ میں لے لیا جائے۔

---

مضمون ذیل مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی نے انڈین ہسٹری کانگریس کے تیسرے اجلاس میں پڑھا تھا جو ۱۹۳۹ء میں کلکتہ میں منعقد ہوئی تھی۔ اصل مضمون انگریزی میں تھا۔ اس کا اردو ترجمہ مولوی صاحب موصوف نے کر کے براہ مہربانی اشاعت کیلئے عنایت کیا ہے۔

# ملک سیف الدین غوری

---

ملک سیف الدین غوری ابتدائی بہمنی دور کا بہت بڑا امیر گذرا ہے۔ یہ بہمنی سلطنت کا سب سے پہلا وزیر اعظم تھا۔ گو سیف الدین کی ابتدائی کی ابتدائی زندگی تاریکی میں ہے لیکن وسطی دکن کے پہلے "وکیل السلطنت" کی حیثیت میں جو مدبرانہ کارنامے انجام دیئے ہیں وہ تاریخ دکن میں نمایاں جگہ رکھتے ہیں اور ان کا جس قدر مطالعہ کیا جائے کم ہے۔ سیف الدین ایک "امیر صدہ" تھا یہ ان امیران صدہ" کی صف اول میں نظر آتا ہے جو چودھویں صدی کے ابتدائی حصہ میں

دکن میں نہ صرف آباد ہوئے بلکہ بہمنی سلطنت قائم کر دی۔ سیف الدین کی
ذات میں سپاہی اور مدبر کے سے دونوں اوصاف جمع تھے۔ اور حقیقت یہ ہے
کہ خود بہمنی سلطنت کی تاسیس اور تعمیر ہی سیف الدین کی رہین منت تھی۔ کیونکہ
اسی سورما نے سلطان محمد تغلق کے خلاف جنگ آزادی دکن کا ڈھنگ ڈالا اور دکن کو
دہلی کے اقتدار سے آزاد کر دیا۔ جب امیران صدہ نے دکن میں اپنی آزادی کا
اعلان کر دیا تو اس وقت سیف الدین ہی ایسا شخص تھا جس نے اس نوخیز سلطنت
کی رہبری کی۔ اندرونی اور بیرونی معاملات میں ہر جگہ اپنا بہترین دل و دماغ صرف
کیا۔ اس نے بڑی عمر پائی تھی۔ اور اگر مورخ فرشتہ کا بیان صحیح سمجھنا چاہیئے تو یہ
ایک سو سات سال زندہ رہا اور وزیر اعظم کی حیثیت میں لگاتار پانچ عہدہائے
حکومت کی وزارت کی۔ اسی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ بہمنی سلطنت مضبوط بنیادوں
پر قائم ہو گئی اور اس کا سیاسی مسلک کوئی ڈیڑھ سو سال تک دکن کے لئے مشعل
ہدایت بنا رہا۔ اسی شخص نے سلطنت بہمنی کی پیش رفت کے لئے وہ دستور مرتب کیا
تھا جو نہ صرف اس سلطنت کے خاتمہ تک دکن کا رہبر بنا رہا بلکہ جو سلطنتیں اسکے بعد
قائم ہوئیں وہ بھی اسی دستور کی خوشہ چینی کے بغیر نہیں رہیں۔ کیونکہ یہ دستور بڑی محنت
سے تیار ہوا تھا۔ اس میں ملک کی تاریخ آب و ہوا قومی اور طبعی خصوصیات سبھی نظر آتا
جھلکتی تھیں۔ تمام دستور جو مرکزی اور صوبہ واری حکومتوں پر حاوی تھا سیف الدین کی
رہبری میں تیار ہوا تھا۔ اس دستور کی ترتیب میں جو اصول استعمال کئے گئے تھے وہ
ایک کتاب میں جمع کئے گئے تھے جو خود سیف الدین نے "نصائح الملوک" کے نام
سے لکھی تھی۔ یہ سیف الدین کی عالمانہ کتاب تھی جو ملک دکن میں مشہور ہے۔

ملک سیف الدین غوری کا گھرا اور خاندان کا پتہ چلانا بہت مشکل ہے اور نہ
یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا خاندان ہندوستان میں کب آباد ہوا تھا۔ فرشتہ اور

دوسرے مورخوں نے غوری کی ابتدائی زندگی سے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ اور یہ اچنبے کی بات ہے کہ علی بن عبداللہ اور مولانا عصامی جو بہمنی دور کے بڑے مستند مورخ ہیں سیف الدین کا مطلق ذکر نہیں کرتے۔ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ سیف الدین غوری قبیلے کا ترک ہے اور ممکن ہے کہ شہاب الدین محمد غوری فاتح ہندوستان کے قبیلے سے وابستہ ہو اور غالباً سیف الدین کے بزرگ اس فاتح ہندوستان کے علم کے پیچھے ہندوستان آئے اور یہاں آباد ہوئے ہوں۔

یہ بات بھی بالکل تشنہ ہے کہ یہ خاندان پہلے ہندوستان کے کسی حصہ میں آباد ہوا اور اس کو زمانہ کے کونسے نشیب و فراز سے دوچار ہونا پڑا۔ سیف الدین کی سیاسی اور تدبیری زندگی پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص ایسے گھر میں پیدا ہوا تھا کہ جہاں علم و شائستگی کی اچھی روشنی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسکے بزرگ تمدن کے بڑے سرمایہ دار تھے اور اپنے دماغ میں سیاسی زندگی کا سودا رکھتے تھے۔

یہ سب پڑھے لکھے تھے اور ان میں تدبیر مملکت کا کچھ نہ کچھ تجربہ بھی تھا۔ اور غالباً وہ علمی و سیاسی سرمایہ ہمیشہ ان کے ساتھ رہا اور اس روشنی میں یہ لوگ دکن کے امیران صدۂ بنائے گئے۔ امیران صدۂ وہ ترک عہدہ دار ہیں جو خلجی اور تغلق دور میں دکن کے نظم و نسق کے ذمہ دار بنائے گئے تھے۔ خلجی اور تغلق بادشاہوں نے جنوب کے اس نو مفتوحہ ملک کے لئے جو مسلم و قوم دکن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے نظم و نسق کا ایک جدید طریقہ تراشا تھا یعنے سو سو گاؤں جوڑ کر نظم و نسق کی اکائیاں بنائی گئی اور ہر اکائی ایک ترک عہدہ دار کے سپرد کی گئی۔ ان سے یہ کہا گیا وہ نہ صرف ان سے علقوں کی مالگزاری وصول کریں بلکہ امن بھی قائم رکھیں۔ مالگزاری کا ایک حصہ خود ان کی خود بسری کے لئے ہی وقف کردیا تھا۔ سو گاؤں کی وجہ سے

جو ان عہدہ داروں کے زیر اقتدار تھے یہ امیران صدہ کہلاتے ہیں۔ کیونکہ یہ اس عالی حلقے "صدی" یا "صدہ" کے نام سے موسوم تھے۔ یہ بالکل ایسے ہی تھے جیسے گلستان میں "ہنڈریڈ" ہوتے تھے۔ سیف الدین بھی انہیں ترک افسروں کی صف میں تھا۔ ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ کیا سیف الدین خود دکن آیا یا اس کے ماں باپ پہلے یہاں آئے اور سیف الدین کی پرورش دکن میں ہوئی۔

یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ "امیران صدہ" کا طبقہ جو سینکڑوں خاندانوں پر مشتمل تھا وسطی دکن کا صحیح تاریخ ساز انہیں لوگوں نے قرون وسطی کی تاریخ بنائی۔ ناصر الدین فتح علاؤ الدین حسن بہمن شاہ اور سیف الدین غوری اس طبقہ کی نمایاں شخصیتیں تھیں اولذکر دونوں یعنی ناصر الدین فتح علاؤ الدین حسن یکے بعد دیگرے بادشاہ ہوئے اور سیف الدین غوری نے صرف وزارت کی جلیل القدر خدمت انجام دی۔ لیکن جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا گیا یہ معلوم ہونے لگا کہ ان تینوں شخصوں میں سب سے زیادہ برگزیدہ شخصیت سیف الدین کی ہے جس نے سیاست اور نظم و نسق کے میدان میں ملک کی زیادہ پائدار خدمت کی۔ سیاسی دور اندیشی اور تدبیر مملکت کے مشغلہ میں یہ اپنے اور ہمعصروں سے بہت آگے تھا۔ اس کا ثبوت اس نے ہر جگہ دیا خواہ وہ میدان جنگ ہو خواہ نظم و نسق اور تدبیر مملکت، شمالی و جنوبی محرکات کے امتزاج سے جو نئے حالات پیدا ہوئے تھے سیف الدین ان کا پورا مدمقابل تھا۔ فرشتہ نے سیف الدین کو "نیکو سیرت اخرومند سخن سنج، مردم شناس اور قدردان" کے بلند پایہ الفاظ سے سراہا ہے۔ ایک اور جگہ اس کو "مرد عاقل اور جہاندیدہ" لکھا ہے۔ ان الفاظ میں مبالغہ نہیں ہے۔ سیف الدین میں سب محاسن جمع تھے۔ اور اسی وجہ سے وہ شاہیر تاریخ کی صف اول میں نظر آتا ہے۔

سیف الدین کی شخصیت اس وقت پہلی مرتبہ روشنی میں آئی جبکہ امیران دکن

اور سلطان محمد تغلق کے درمیان لڑائی ٹھن گئی۔ تمام امیران صدہ کے ساتھ سیف الدین کو اپنے ہاتھ میں تلوار لینی پڑی۔ جب سلطان محمد تغلق گجرات اور مالوے کے باغیوں کے ساتھ الجھ گیا تو اور اس کو اس لڑائی کے لئے کمک کی ضرورت ہوی۔ اس لیئے اس نے دکن کے امیران صدہ کو اپنی مدد کے لئے بلایا۔ اسکے حکم پر چند امیروں کو دولت آباد سے روانہ بھی کیا گیا کیونکہ یہ شاہی حکم تھا اور دکن کے گورنر نظام الدین اس حکم سے کیونکر سرتابی کرتا۔ لیکن یہ امیر دولت آباد سے نکل کر ابھی دو چار منزل ہی گئے تھے کہ ان کے دلوں میں بادشاہ کی طرف سے طرح طرح کے شبہے آتے گئے۔ اور ان کو ڈر ہوا کہ کہیں ان امیروں کا وہی حشر ہو جو گجرات اور مالوے والوں کا ہوا تھا۔ کیونکہ بادشاہ نے اپنی ضد میں گجرات اور مالوے کے امیران صدہ کو بہت ستایا تھا۔ یہ امیران دکن پیچھے پاؤں پلٹ گئے۔ پھر کیا تھا تمام دکن میں ایک لڑائی ٹھن گئی کیونکہ بادشاہ کے حکم کی سرتابی کرنا ایک کھلی بغاوت تھی۔ بادشاہ مالوے سے دکن کی طرف پلٹ پڑے اور امیران صدہ نے دولت آباد میں قلعہ بند ہو کر مقابلہ کیا۔ انہیں حالات میں سیف الدین نے اپنے ساتھی امیروں کے ایک دستہ کے ساتھ اس میدان میں سلطان محمد تغلق کا مقابلہ کیا۔ یہاں ایک مرتبہ علاؤالدین خلجی اور شنکر دیو کا آمنا سامنا ہو چکا تھا لیکن ابھی لڑائی ختم نہیں ہوی تھی کہ بادشاہ کو گجرات سے بلاوا آیا۔ وہاں ایک نیا باغی کھڑا ہو گیا تھا۔ بادشاہ نے دکن کی مہم عماد الملک سرتیز کے سپرد کر کے خود گجرات چلا گیا۔ شاہی فوج کا ایک طبقہ گلبرگہ پر بھی حملہ آور ہوا تھا جہاں ظفر خاں اور سیف الدین قدم جمائے ہوئے تھے۔ اس لڑائی میں شاہی افسر عماد الملک سرتیز کھیت ہو گیا۔ شاہی فوج تتر بتر ہو گئی ادھر دولت آباد کی دیواروں کے سامنے ہی شاہی فوج شکست کھا گئی۔ اور دکن نے بالآخر ۱۳۴۵ء میں خود مختاری کا

اعلان کر دیا۔ اس سلطنت دکن کا پہلا بادشاہ ناصر الدین شاہ (اسمٰعیل فتح) تھا اور دو سال کے بعد ۱۳۴۷ء میں علاؤ الدین حسن بہمن شاہ (ظفر خاں) بادشاہ ہو گیا۔ آخر الذکر بادشاہ کی وجہ سے جو بہمن بن اسفندیار کی اولاد میں سے تھا۔ یہ سلطنت دکن، سلطنت بہمنی کہلانے لگی۔

سیف الدین غوری کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے دکن کی سلطنت بہمنی کے لئے ایک سنجیدہ نظم و نسق اور ایک صحت بخش اور خوشگوار دستور بنایا۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ اس شخص میں سپاہیانہ جوہر بھی تھے جو اس سلطنت کی تاسیس کے وقت ظاہر ہوئے۔ لیکن سچ پوچھو تو وہ سیف الدین ایک سیاس اور مدبر مملکت تھا اور صرف وہی اس نو عمر سلطنت کی ذمہ داریاں برداشت کر سکتا تھا۔

اس سلطنت کے انصرام کے لئے جو نظام حکومت مرتب ہوا تھا وہ سیف الدین کی کوششوں کا پھل تھا۔ یہ نظام حکومت چودھویں صدی کے وسط میں تیار ہوا تھا مگر پشتوں تک جاری رہا اور نہ صرف اس سے بہمنی سلطنت کی رہبری ہوئی بلکہ آنیوالی سلطنتوں نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امیران دکن سیف الدین غوری کی ذہنی رسائی اور سیاسی رجحان سے ناواقف نہ تھے خود بہمن شاہ بھی اس سے واقف تھا اور اس کو قریب سے دیکھ چکا تھا اور اس لئے وہ سلطنت کی سیاسی رہبری کے لئے سیف الدین کے سوا کسی دوسرے شخص کو کیوں نامزد کرتا۔ جیسے مولانا عصامی فرماتے ہیں کہ جب علاء الدین بہمن شاہ کی بادشاہی کا اعلان ہوا تو فوراً ایک مرکزی حکومت ترتیب دی گئی جس میں فوجی و غیر فوجی بہترین عہدہ دار تھے۔ اس طویل فہرست میں جہاں دوسرے اور بڑے بہمنی عہدہ دار پائے جاتے ہیں۔ صدر الشریف۔ اسمٰعیل فتح۔ بہرام خاں مازندرانی صفدر خاں سیستانی۔ بہہ احمد غزنوی بسیف الدین غوری کے بڑے نام زیب

فہرست تھے۔ یہ لوگ ترتیب وار امیر الامراء گورنر دولت آباد گورنر ورنگل مفتی اور وزیر اعظم کی خدمات پر فائز تھے۔ آخر الذکر سلطنت کی جلیل القدر خدمت پر فائز تھا اور اپنی انہیں صلاحیتوں اور گزشتہ خدمتوں کا لحاظ رکھتے اس عزت کا مستحق بھی تھا۔ سیف الدین کی بڑی عزت کیجاتی تھی۔ اور دربار میں اس کی نمایاں جگہ تھی۔ اس کو نہ صرف بہمنی دربار میں بیٹھنے کی اجازت تھی جو بہت بڑا امتیاز تھا بلکہ اس کو اسمٰعیل فتح سے بلند تر جگہ نشست دیجاتی تھی۔ حالانکہ اسمٰعیل آج سے کچھ دنوں پہلے ملک دکن کا بادشاہ تھا۔ فرشتہ ایک خاص دربار کا نقشہ کھینچتا ہے جو عید نوروز کے موقع پر منعقد ہوا۔ اس دربار کا واقعہ ہے کہ بادشاہ نے صدر الشریف اور سید احمد غزنوی کو اشارہ کیا کہ ملک سیف الدین غوری کو اسمٰعیل فتح سے بلند تر نشست پر بٹھائیں۔ چنانچہ بادشاہ کے حکم کے مطابق یہ دونوں بزرگ اُٹھے اور سیف الدین کا ہاتھ پکڑ کر سامنے تک لائے اور اسمٰعیل فتح سے پہلے بٹھائے اس پر طرہ یہ کہ بادشاہ نے سیف الدین کے گھرانے سے ازدواجی تعلقات بھی پیدا کئے۔ خود علاء الدین حسن نے سیف الدین کی بہن سے شادی کی۔

سیف الدین کی بیٹی شاہ بیگم ولیعہد سلطنت محمد خاں سے بیاہی گئی۔ یہ شادی ۷۵۲ھ میں بڑی دھوم دھام سے رچائی گئی تھی۔ اس کے بعد سیف الدین کی پوتی مجاہد شاہ سے بیاہی گئی تھی جو علاء الدین حسن کا پوتا تھا۔

یہ کھلی بات ہے کہ بہمنی سلطنت ایک نوخیز سلطنت تھی۔ اس میں نظام حکومت کہاں سے آتا جب پہلے پہل یہ سلطنت صورت گر ہوی تو یہ ایک جغرافی منظر سے زیادہ نہ تھی جس میں جگہ جگہ فوجی پڑاو پڑے ہوے تھے۔ غالباً اس سلطنت کا وہی نقشہ تھا جو تغلق خاں کے زمانہ میں تھا جبکہ وہ سلطان محمد تغلق کی سیادت میں دکن کی گورنری کرتا تھا۔ اس وقت سیف الدین کا کام تھا کہ فوجی اور غیر فوجی نظموں

کے ذریعہ ملک پر گرفت قائم کرے اور ضبط و نظم قائم کرکے ملک کو شائستہ بنائے۔ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام آسان نہ تھا۔ اس کے لئے ملک کے پورے مطالعہ کی ضرورت تھی۔ ملک کا جغرافیہ اور فوجی خصوصیات کو دیکھنا تھا۔ اور ان نشیب و فراز پر نظر رکھنی تھی جو مسلمانوں کی آمد سے ملک میں پیدا ہو چکے تھے۔ کیونکہ اس مطالعہ کے بغیر کوئی دستور نہیں بن سکتا۔ دستور ایسا ہونا چاہیئے جو وقت اور قوم کے اقتضار کو ادا کر سکے۔

سیف الدین نے ان نظام ہائے حکومت کو بھی دیکھا تھا جو ایک طرف دکن کے قدیم زمانہ میں رائج ہو چکے تھے۔ اور دوسری طرف دہلی میں ترک بادشاہوں نے رواج دیا تھا۔ اس طرح بہمنی دستور شمال اور جنوب کی دوسری روایات اور تجربوں کا آمیزہ تھا۔ اس دستور کو قدیم و جدید روایات کا نمائندہ کہنا چاہیئے اور اس میں بڑی پائیداری تھی کہ یہ کئی پشتوں تک کام آیا اور اس وقت تک چلتا رہا جبکہ بہمنوں کا زوال ہو گیا اور دکن میں چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم ہو گئیں۔ خود مرہٹہ سلطنت میں جو سترویں اور اٹھورویں صدی میں قائم ہوئی اس دستور کی خوشہ چینی تھی اب بھی دکن کی تہذیب و تمدن میں اس کے نقوش پائے جاتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس دستور میں مرکزی اور صوبہ واری حکومتوں کے ڈھانچے ایسے جوڑے گئے تھے کہ جن میں فرائض اور اختیارات کی پوری حد بندی تھی۔ مرکزی حکومت بادشاہ اور وزرا پر مشتمل تھی۔ چونکہ بادشاہ اپنے شاہانہ اختیارات کو بغیر وزرا کے مشورے کے نہیں استعمال کرتا تھا۔ اس لئے اس نظم کو بادشاہ باجلاس وزرا کہنا چاہیئے بادشاہ کے ساتھ آٹھ وزرا تھے اور یہ اپنے فرائض کے انصرام میں بادشاہ کے سامنے ذمہ دار تھے۔ اب رہی صوبہ واری حکومت تو اس کا یہ حال تھا کہ ملک کے چار صوبہ بنائے گئے تھے جو "طرف" کہلاتے تھے۔ یہ تقسیم تو قتلغ خاں سے آرنہ ملی تھی

جو سلطان محمد تغلق کی جانب سے دکن کا گورنر تھا۔ لیکن بہمنیوں نے اس اصول کو بہت آگے بڑھایا۔ نہ صرف چار طرف بنائے بلکہ مرکز سے ان کو اس طرح وابستہ کر دیا کہ کام بڑی خوش اسلوبی سے چلتا تھا۔

جن اصولوں پر یہ بہمنی دستور قائم کیا گیا تھا وہ ایک کتاب میں جمع کئے گئے تھے۔ خود بانی دستور نے "نصائح الملوک" کے نام سے یہ کتاب لکھی تھی۔ گو یہ کتاب اب بالکل ناپید ہے۔ تاہم دکن میں اس کو سب جانتے ہیں اور تاریخ والوں کے ذہن سے یہ محو نہیں ہوئی۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ بعض متاخرین نے اس کتاب کے اکثر حصے اپنے ہاں نقل کر لئے۔ چنانچہ ان کی کوششوں سے یہ حصے مل جاتے ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے خیالات کیا تھے اور وہ ان خیالات کو کس طرح عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا۔ چونکہ سیف الدین ایک عملی سیاست دان تھا وہ جانتا تھا کہ کونسے اصول قابل عمل ہیں اور ان کو کس طرح عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے۔ نصائح الملوک اصل میں بہمنی نظام حکومت کا پس منظر ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح آلات حکومت کو دستور اقتدارات کے ساتھ ہمنوا بنایا گیا۔ گو یہ بتانا مشکل ہے کہ کس سنہ میں یہ کتاب لکھی گئی تھی۔ لیکن قیاس یہ ہے کہ یہ کتاب اس تشکیلی عہد کی پیداوار ہے جبکہ بہمنی دستور صورنگر ہو رہا تھا۔ دستوری اصول ایسے پیرایہ میں بتائے گئے ہیں کہ راست الفاظ میں نہیں بلکہ وہ بادشاہ کے لئے نصیحتیں ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ سیف الدین بادشاہ کو ایک عینی حکمران کے جامہ میں دیکھنا چاہتا ہے۔ یعنی اس کا خیال یہ ہے کہ ایک بادشاہ ایسا کامیاب ناخدائے سیاست ہونا چاہئے جس میں بلند کردار اور اخلاقی محاسن جمع ہوں۔ وہ ایسا علمی و نظری آدمی ہی نہ ہو جیسے افلاطون کا فلسفی بادشاہ تھا۔ ان اوصاف وہ قویٰ کے علاوہ جو قدرت کی

دو صفات ہوتے ہیں۔ مثلاً بلند پایہ کردار اور بلندی بخت۔ ایک بادشاہ میں اور محاسن بھی ہونے چاہیئے۔ ایک بات تو جوہر شناسی ہے یعنی وہ اہل علم و ہنر کو پہچانے اور ان کی صلاحیتوں کے مطابق ان کی قدر کرے۔ اور ترقی دے۔ دوسرے ہوشیاری ہے یعنی وہ ہمیشہ اپنی سلطنت کے دشمنوں سے باخبر رہے اور ان کے مقابلہ کا انتظام کرے۔ یہ دراصل ملک کی مدافعت کا مسئلہ ہے۔ بغیر دفاعی انتظام کے کوئی سلطنت قائم نہیں رہ سکتی۔ تیسرے معاملہ فہمی ہے۔ یعنی تمام امور سلطنت کا خود جائزہ لے اور گہری نظر سے فیصلہ کرے۔ انصرام سلطنت میں بادشاہ کو اپنے درباریوں پر کبھی اعتماد نہیں کرنا چاہیئے اور بالخصوص ایسے لوگ جو خوشامد کرکے اپنا مطلب نکالتے ہیں۔ بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ چوتھے فراخ حوصلگی یعنی سلطنت کی ضروریات میں دل کھول کر روپیہ خرچ کرے۔ روپیہ کے خرچ میں کبھی تنگ دلی سے کام لینا نہیں چاہیئے ورنہ سلطنت کبھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ پانچویں دوراندیشی یعنی مستقبل پر نظر رکھے۔ آئندہ ہونے والے واقعات کی پیش قیاسی کرکے قبل از وقت ان کا انتظام کرے۔ ظاہر ہے کہ اس خصوص میں بادشاہوں کو گزشتہ تاریخ سے بھی فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ کیونکہ گزشتہ تاریخ تمام تجربات کا مخزن اور مستقبل کیلئے مشعل ہدایت ہوتی ہے۔ چھٹے شاہانہ مزاج اور دریا دلی ہے یعنے تمام رعایا کو فیض عام سے سرفراز کرے اور خصوصاً اہل علم و شریعت کیساتھ اچھا سلوک کرے اور ان کی عزت کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بادشاہ تمام طبقات ناس سے وابستہ رہیگا۔ ساتویں مذہب پرستی ہے جو بادشاہوں کیلئے بہت ضروری ہے۔ تمام معاملات میں مذہب کو پہلا درجہ دینا چاہیئے۔ دنیوی اغراض کے لئے مذہب کو کبھی پس پشت نہیں ڈالا جاسکتا کیونکہ سلطنت اور تمام اہل سلطنت کیلئے مذہب بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر نظم و نسق اور انصاف نہیں چل سکتا۔ آٹھویں چیز یہ ہے کہ بادشاہ میں وقار اور بردباری ہونی چاہیئے کہ وہ خود بد نما حرکات کا مرتکب

ہو اور غرباء و بیکسوں کی فروگزاشتوں کو درگذر کرے۔ بادشاہی کا تقاضا ہے کہ وہ
اپنا مرتبہ بلند رکھے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ ہمیشہ بلند چیزوں پر نظر رکھے اور چھوٹی چیزوں
کو درگزر کرے ورنہ سلطنت میں اس کا وقار نہیں رہے گا۔ نویں چیز وسعت اخلاق
اور معافی ہے یعنے وہ رعایا کے تمام طبقات کیساتھ مہربانی سے پیش آئے اور شاہانہ
عنایات سے سب کو خوش رکھے تاکہ رعایا بادشاہ کی خیر خواہ اور جان نثار بنی رہے
دسویں چیز حسن تدبیر ہے یعنے اپنی ہوشیاری اور دانائی سے اپنی سپاہ کو قوی دل بنائے
تاکہ ہر آڑے وقت دشمن کا اچھا مقابلہ ہوسکے اور آخری چیز درباروداری ہے جو انصرام
مملکت کے لئے بہت ضروری ہے۔ سیف الدین کا خیال یہ ہے کہ بادشاہ
اکثر دربار عام منعقد کرتا رہے جس میں عوام و خواص سبھی طرح کے لوگ آئیں۔ کیونکہ دربار
کے ذریعہ بادشاہ اپنی رعایا سے وابستہ ہوسکتا ہے۔ دربار میں بادشاہ کو پہلے
اپنا وقار قائم رکھنا چاہئے۔ اس طرح جلوس کرے کہ اس سے کوئی بدنما حرکت
سرزد نہ ہو۔ دوسرے نہ صرف سب کا سلام لے بلکہ خاص و عام کے عرائض سنے
اور ان کے متعلق مناسب احکام جاری کرے۔ آخر میں سیف الدین نے بادشاہ
کے اس فرض پر بہت زور دیتا ہے کہ وہ ہر معاملہ میں اپنے وزراء سے مشورہ کرے
تاکہ اس سے کوئی غلطی سرزد نہ ہو اور ملک اور اہل ملک کو نقصان نہ پہنچے۔ اس بیان
سے معلوم ہو رہا ہے کہ سیف الدین شاہی کو ایسا ادارہ بنانا چاہتا ہے جو وزراء سے
گھرا ہوا رہے اور بادشاہ وزارتی مشورہ کا پابند رہے گویا دوسرے الفاظ میں اس
ادارۂ شاہی کو بادشاہ با جلاس وزراء رکھنا چاہئے جیسے انگلستان میں بادشاہ با جلاس
پارلیمنٹ ہوتا ہے۔ سیف الدین کے ذہن میں پارلیمنٹ تو نہیں تھی صرف وزراء
تھے جن کے مشورہ کا بادشاہ پابند ہے اس میں وزارتی ذمہ داری کا ایک رنگ
پایا جاتا ہے۔ انگلستان کے بادشاہ بھی اس زمانے میں کابینہ کے مشوروں کے پابند

ہوتے ہیں۔ مشورہ کے متعلق جن کا بادشاہ پابند ہے۔ سیف الدین نے چند شرائط بھی عائد کئے ہیں وہ حسن نیت، خلوت، حسن سلوک اور استشارہ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہ اول تو خلوص نیت سے مشورہ کرے۔ دکھاوے سے کوئی فائدہ نہیں۔ دوسرے مشورہ میں راز داری ہونی چاہیئے۔ بعض امور ایسے بھی ہوتے ہیں کہ قبل از وقت شائع ہو جانے سے نقصان پہنچتا ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ مشورہ کرنے میں اہل مشورہ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہیئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وزرا، پوری صداقت کے ساتھ مشورہ دیں اور ضرورت کے وقت مخالفت بھی کریں اور بادشاہ کو چاہیئے کہ اچھی اور بری چیز کو دل لگا کر سنے۔ مخالفت پہ برہم نہ ہو اور اہل مشورہ کو نقصان نہ پہنچائے۔ آخری چیز یہ ہے کہ مشورہ صحیح معنوں میں ہونا چاہیئے۔ یہ چیزیں اس وقت دستور انگلستان میں پائے جاتے ہیں۔ شاہِ انگلستان کو ان شرائط کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ گویا یہ دستوری شاہی ہے اور بادشاہ کی ذمہ داری وزراء میں منتقل ہو جاتی ہے۔

یہ تو بادشاہ کے ذاتی اوصاف اور ذمہ داریاں ہوئیں لیکن اس کے بعد سیف الدین نے چند انتظامی ذمہ داریاں بھی بتائی ہیں۔ گو یہ ذمہ داریاں بھی بظاہر بادشاہ پر عائد ہوتی ہیں لیکن ان کی شان انتظامی ہے اور یہ مملکت کے فرائض اور انتظامات سے متعلق ہیں۔ بادشاہ کو یہ نصیحت کی گئی ہے کہ عہدہ داران سلطنت کے انتخاب اور تقرر میں خاص احتیاط سے کام لے۔ سیف الدین یہ چاہتا ہے کہ بادشاہ ایسے لوگوں سے احتراز کرے جو خود غرض زمانہ ساز اور حریص و لالچی ہوتے ہیں کیونکہ ایسے اشخاص سے نہ صرف مملکت کا کام نہیں چل سکتا بلکہ الٹے نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے۔ فوج میں ایسے لوگ مامور ہونے چاہیئے جو تیراندازی شمشیر زنی اور گھوڑے کی سواری میں اچھی مشق رکھتے ہوں۔ کیونکہ ان اوصاف کے بغیر سپاہیانہ کام نہیں ہو سکتا

لیکن ان چیزوں کے ساتھ سیف الدین نے اس بات پر بھی زور دیا کہ عہدداروں کے انتخاب میں حسب و نسب کا پورا لحاظ ہونا چاہیئے۔ اگر عہدہ دار اور گھرانے کے لوگ ہوں تو بہت اچھا ہے ورنہ شاہی خاندان کے افراد امیر اور رئیس گھرانے کے لوگ بہت مفید ہوتے ہیں کیونکہ ان کے ساتھ قدیم روایتیں وابستہ ہوتی ہیں اور یہ روایتیں نہ صرف کارکردگی بڑھاتی ہیں بلکہ وفاداری و جاں نثاری کے لئے ابھارتی ہیں۔

اس کے بعد سیف الدین نے مملکت کے دائرۂ عمل اور حکومت کے فرائض سے بحث کی اور یہ بتایا کہ کس شعبے میں کیسا آدمی کام کر سکتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ مملکت کا دار و مدار دو طبقہ جات پر منحصر ہے جن کی خدمات بالکل ناگزیر ہیں۔ پہلی قسم میں وہ لوگ آتے ہیں جن کو "اہل السیف والعلم" کہنا چاہیئے جو علم تلوار کے دھنی ہوتے ہیں اور دوسری قسم میں وہ لوگ آتے ہیں جو "اہل العلم والقلم" کہلاتے ہیں۔ یہ اہل علم اور قلم کے دھنی ہوتے ہیں۔ طبقہ تو مملکت کی مدافعت کا ذمہ دار ہے۔ یہی ملک کی عزت جان اور مال کی سلامتی لاتا ہے۔ ان کی تربیت اور صلاحیتوں کے مطابق ان لوگوں کی تقسیم ہونی چاہیئے۔ سیف الدین اس لئے تو طبقے کرتا ہے اور ہر طبقے کو مختلف فرائض دینا چاہتا ہے۔ مثلاً قلعہ داری رہداری سپاہ داری وغیرہ اب ایسے اہل علم تو وہ ملک کے نظم و نسق اور خوشحالی کے ذمہ دار ہیں۔ اس طبقے کی وہ پھر ۹ شعبے بنایا ہے جن کے تفویض ملک کے مختلف فرائض اور شعبے ہونی چاہئیں۔ سیف الدین کا خیال یہ ہے کہ امور مملکت کے ۹ شعبے ہوتے ہیں جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے مختلف عہدہ داروں کے تفویض ہونے چاہئیں یہ عہدہ دار وکیل، وزیر، دبیر، بخشی، داروغہ، سہولی داروغہ، بیوتات داروغہ شاگرد پیشہ، چوکی پولس وقائع نگاری ایلچی، داروغہ، ہرکارہ۔ محاسب تحصیلدار صدر قاضی۔ مفتی، مصاحب اور محتسب ہوتے ہیں۔ اس کے بعد وہ پادشاہ کو نصیحت

کرتا ہے کہ یہ فرائض ایسے شخص کے تفویض ہونے چاہئیں جو اس کا پوری طرح اہل ہو۔ اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سیف الدین نے مملکت کے فرائض اور کار و بار کی کس گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ انسانی کردار اور صلاحیتوں کا اس کو کس قدر علم تھا۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ سیف الدین نے امور مملکت کی دو قسمیں کی ہیں۔ ایک فوجی یعنے ملٹری اور دوسرے غیر فوجی یعنے سیول اور اسی روشنی میں وہ عہدہ داروں کی ایسی تقسیم کرتا ہے جیسے زمانہ حال کی مملکتوں میں ہوتا ہے۔
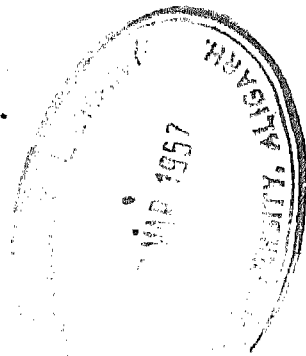
---

# اغلاط نامہ مسئلہ تعلیم

صفحہ ۱۲ سطر ۱۱ صحیح انگریزی نام Jood ہے۔

″ ۱۹ ″ ۷ بجائے ”مسکہ“ پڑھا جائے ”مسئلہ“

″ ۳۶ ″ ۱۱ بجائے ”تخت و زندگی“ پڑھا جائے ”تخت زندگی“

″ ۴۱ ″ ۱۴ بجائے ”اس تعداد“ پڑھا جائے ”ایسی تعداد“

″ ۴۴ ″ ۳ صحیح نام Sommerfelt ہے۔

″ ۵۰ ″ ۹ یہ عبارت جلی خط میں ہونی چاہئے۔

″ ۵۱ ″ ۸ بجائے ”کے تنظیمات“ پڑھا جائے ”کے تابع تنظیمات“

″ ″ ″ ۱۰ لفظ ”ادارے“ کے بعد قوس کی شکل ) ہونی چاہئے نہ کہ (۔

″ ۵۶ ″ آخری بجائے ”ضرورت“ پڑھا جائے ”ضرورت نہ ہوگی۔

″ ۵۷ ″ ۱۱ بجائے ”بعد برٹش“ پڑھا جائے ”بعد کو برٹش“

″ ″ ″ ۱۲ لفظ ”فرقہ وارانہ“ کے بعد خط (-) کھینچا جائے۔

″ ۵۸ ″ ۱۱ عبارت ”کے لئے“ ...... کمیٹی نے“ حذف کی جائے۔

″ ″ ″ آخری انگریزی نام Robert Owen ہے۔

″ ۵۹ ″ ۷ بجائے ”پیلس“ پڑھا جائے ”پلیس“

″ ۶۴ ″ ۲۰ الفاظ ”پانے والے“ کے بعد اضافہ کیا جائے ”بچوں پر احسان کیا صرف“

″ ۶۷ ″ ۹ صحیح انگریزی نام Poverty and Progress ہے۔

″ ۶۸ ″ ۱۷ صحیح لفظ ”پریزیڈنٹ“ ہے۔

″ ۶۹ ″ ۱۶ بجائے ”اصلاحی“ پڑھا جائے ”اصلاح“

″ ۷۳ ″ ۱۴ سنہ ۱۸۶۱ پڑھا جائے۔

″ ۷۴ ″ ۵ بجائے ”یا و گروہ“ پڑھا جائے ”یا گروہ“

″ ″ ″ ۹ بجائے ”اس کو سرٹیفکٹ“ پڑھا جائے ”اسکول سرٹیفکٹ“

″ ۷۸ ″ ۵ بجائے ”چند اسکول“ پڑھا جائے ”کچھ اسکول“